ناشر: مکتبہ صفدریہ

نزد مدرسہ نصرۃ العلوم گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

فہرست مضامین

تصدیقات

۱۔ تصدیق استاذ العلماء حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی دامت برکاتہم سابق وزیر معارف شرعیہ ریاست ہائے متحدہ بلوچستان وسابق شیخ التفسیر دارالعلوم دیوبند وشیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل وحال شیخ التفسیر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

میں نے فاضل جلیل مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خاں صاحب صفدر فاضل دیوبند کی کتاب "صرف ایک اسلام" بجواب "دو اسلام" کے حصہ اوّل کا مطالعہ کیا یہ کتاب مسٹر غلام جیلانی برق کی کتاب دو اسلام کی تردید میں لکھی گئی ہے مسٹر موصوف بظاہر منکر حدیث اور در پردہ منکر اسلام معلوم ہوتا ہے اس نے شانِ برقیت کی نمود کے جوش میں احادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلّم یا خرمن اسلام پر جو چھپتیں کا تیر برسائے ہیں

اس کتاب میں ان کا محققانہ اور دندان شکن جواب دیا گیا ہے جوابات اس قدر محققانہ دل آویز اور پُر اثر ہیں کہ جس کے دل میں شمع عرض غیرہ کی مقدار خدا ترسی یا شرفِ انسانی موجود ہو وہ اس کتاب سے ضرور متاثر ہوگا۔ اس کتاب میں برق صاحب کی نقل کردہ تحریرات کو دیکھ کر ہمیں اعتراف کرنا پڑا۔ کہ مغرب زدگی اور افرنگ پرستی کی قوتِ بگاڑ کے لیے کوئی حد مقرر نہیں اور یہ کہ اس ملعون دور میں شقاوت انسانی کے لیے کوئی سرحد متعین نہیں کی جا سکتی مقام تعجب ہے کہ ذہنی غلامی اور عبدیتِ افرنگ انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ بہر حال مولانا صفدر صاحب اپنی کوشش میں کامیاب ہے اور کتاب اپنے موضوع میں لاجواب ہے ہماری دعا ہے کہ صف اعدائے اسلام کی شکست کے لیے آپ کی شانِ صفدری میں روز افزوں اضافہ ہو فقط والسلام

شمس الحق عفا اللہ عنہ زرگر آبادی پشاور

۲۔ فخر الاماثل سند العلماء حکیم الاسلام حضرت الحاج الحافظ مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دار العلوم دیوبند

مخدوم و محترم زاد مجدکم۔ سلام مسنون نیاز مقرون .....

منکرین حدیث کے مقابلہ کی تحریر بھی پڑھی سبحان اللہ بہت ہی تحقیق کے ساتھ آپ نے مواد قلمبند فرمایا ہے مگر لب و لہجہ بہت ہی نرم ہے جس کے یہ کمینے مستحق نہیں ہیں جنہوں نے اپنے ناپاک لب و لہجہ کا رُخ اللہ تعالیٰ و رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تک کی طرف پھیر رکھا ہے۔ میں بحمد اللہ بعافیت ہوں۔

والسلام

محمد طیب از دیوبند

۲۔۷۔ھ

دیباچہ

طبع سوم

راقم الحروف نے آج سے تقریباً دس سال پہلے نیو سنٹرل جیل ملتان میں صرف ایک اسلام کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے حدیث اور اسلام کے واضح عقائد اور مسلّمات کے برعکس چند غلط نظریات پر تنقید کی گئی تھی بسلسلۂ تحریک ختم نبوۃ قید و بند کا زمانہ تھا کتابوں کا ذخیرہ پاس وافر نہ تھا تاہم جو تنقید اور گرفت راقم نے اس بے سرو سامانی کے وقت کی تھی وہ بحمد اللہ تعالےٰ نہایت ٹھوس اور بڑی معقول ثابت ہوئی علماء کرام اور تعلیم یافتہ طبقہ نے اسے بڑا سراہا اور اس کی بڑی تحسین کی حتیٰ کہ خود برق صاحب نے باوجود کڑی تنقید ہونے کے اس کو پسند کیا اور ۱۵ ر جولائی ۱۹۵۷ء کو راقم کے نام پر ذیل کا خط شکریہ کے طور پر روانہ کیا۔ اس خط کا متن یہ ہے۔

"محترم۔ السلام علیکم۔ دو اسلام کے جواب میں نصف درجن کے قریب کتابیں نکل چکی ہیں جن میں سے مجھے آپ کی کتاب صرف ایک اسلام بوجوہ پسند آئی۔ اوّل اس لیے کہ اس میں گالیاں کم تھیں (بلکہ بالکل نہ تھیں۔ صفدر) دوم انداز تحریر ادیبانہ تھا۔ سوم اور میری اغلاط کی وضاحت عالمانہ تھی میں طبع نو کے "حرف ثانی" میں آپ کا شکریہ خاص طور سے ادا کر رہا ہوں طبع نو سے اغلاط نکال دی ہیں اور انداز بیان کو بہت

نرم کر دیا گیا ہے مجھ سے جو غلطیاں ہوئیں اُن میں بدنیتی کو دخل نہیں
تھا بلکہ ایک جگہ میں ایک دُعا کو آیت سمجھ گیا اور ۱۲ مقامات پر
الفاظ حدیث کا ترجمہ نافہمی سے غلط کر دیا تھا رہا یہ مسئلہ کہ حدیث
وحی خفی ہے یا نہیں اور صحاح کی تمام روایات صحیح ہیں یا نہیں اس
معاملہ میں آپ میں ـــــ سے کوئی صاحب مجھے مطمئن نہ کر
سکا اور اس لیے میں اپنے موقف پر بدستور قائم ہوں کہ حدیث وحی
ہرگز نہیں اور صحاح کی تمام احادیث صحیح نہیں اور خصوصاً مباشرت
بہ صوم وحیض کی روایات وہ ازبس افسوسناک ہیں میرا خیال ہے کہ
دیر وزود آپ حضرات کو بھی اسی راہ پر چلنا پڑے گا۔

مقصد :-

اس ... کا مقصد ایک تو آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا اور دوم مسجد اقصیٰ والی
حدیث بخاری کے متعلق آپ کے جواب پر کچھ عرض کرنا تھا تورات
کی جو آیات آپ نے نقل کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت
یعقوب علیہ السلام نے دو مذبح یا معبد قائم کیے تھے ایک لُوز کے
مقام پر بیت ایل کے نام سے اور دوسرا سالم کے مقام پر ایل الٰہ اسرائیل
کے نام سے اگر یہ معبد کوہِ موریا پر ہوتے جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام
نے بیت المقدس تعمیر کیا تھا تو لازماً حضرت یعقوب علیہ السلام بیت
المقدس کے بانی اوّل شمار ہوتے اور آپ کا جواب سو فیصد صحیح ہوتا
لیکن حقیقت یوں نہیں انسائیکلوپیڈیا برطانیکا Ralaalina -
(فلسطین) کے تحت دورِ موسیٰ و ہارون علیہم السلام کا نقشہ دیا ہوا ہے
جس میں بیت ایل اور سالم ہر دو کا ذکر ہے بیت ایل یروشلم سے

سیدھا گیارہ میل شمال میں اور سالم پورا چالیس میل شمال میں واقع ہے اس لیے ان کی بنیادوں پر مسجد اقصیٰ کی تعمیر نو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا زیرلفظ Beth (بیت ایل) جب حضرت یعقوبؑ اپنے بھائی عیسو سے ڈر کر اپنا گھر (اُس وقت بیر سبع اور آج کل بیر شیبہ یروشلم سے ۸۶ میل جنوب میں) چھوڑ بھاگے تو اُن کی منزل شام کا شہر حرّان (ابن تیمیہؒ کا مولد) تھا راہ میں بیت اللحم (یروشلم سے گیارہ میل جنوب) بیت ایل اور سالم اور دیگر بستیاں ہیں مؤخر الذکر مقامات پر انہوں نے ایک آدھ پتھر ستون کی طرح گاڑ کر انہیں معبد بنا ڈالا بس یہ ہے تعمیرات یعقوب علیہ السلام کی حقیقت۔ والسلام

مخلص برق

اور دو اسلام صفحہ ۵۰ طبع ششم میں لکھتے ہیں کہ (جن حضرات نے مجھ پر تنقید کی ہے ان میں سے چار حضرات کی کتابیں قابل توجہ ہیں ان میں ایک صرف ایک اسلام از مولانا محمد سرفراز خاں خطیب گکھڑ ہے) ایک لحاظ سے میں ان حضرات کا مشکور ہوں اور خصوصاً مولانا محمد سرفراز خاں کا کہ انہوں نے میری بعض اغلاط واضح کیں موجودہ ایڈیشن کو ان اغلاط سے پاک کر دیا گیا ہے اور تحریر کی تلخی کو بھی بڑی حد تک کم کر دیا گیا ہے اغلاط کی نوعیت یہ تھی کہ ایک جگہ میں ایک دعا کو آیت سمجھ کر لکھ گیا تھا تین چار مقامات پر عربی متن کا ترجمہ نافہمی سے غلط کر ڈالا تھا اور دو چار جگہ تنقید غلط ہو گئی تھی ان کتابوں سے اتنا ہی فائدہ ہوا کہ میں ان اغلاط سے بچ گیا رہا اصل موضوع کہ حدیث وحی ہے یا نہیں اور صحاح کی تمام احادیث صحیح ہیں یا نہیں جوں کا توں رہا اور یہ حضرات میرے علم میں کوئی اضافہ نہ کر سکے

مولانا سرفراز صاحب کے سوا کہ انہوں نے کتاب میں کافی حد تک سنجیدگی سے کام لیا ہے باقی حضرات نے سب وشتم کا وہ مظاہرہ کیا ہے کہ شائد کوئی شستہ مذاق انسان ان کا ایک صفحہ بھی پڑھ سکے اھ

برق صاحب کا یہ بیان جو خط اور کتاب دونوں میں انہوں نے لکھا ہے ذیل کے امور پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتا ہے :۔

(۱) کہ صرف ایک اسلام وہ کتاب ہے جس میں متانت وسنجیدگی کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور جس میں سب وشتم نہیں یا بہت کم ہے اور اس میں ان اغلاط کی نشاندہی کی گئی ہے جو برق صاحب کے نزدیک بھی واقعی اغلاط ہیں اور جن سے انہوں نے رجوع کر کے بقول خود موجودہ ایڈیشن کو اغلاط سے پاک کر دیا ہے اور اس کتاب کی ادیبانہ اور عالمانہ تنقید پر وہ اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ وہ راقم الحروف کا شکریہ ادا کریں اور اپنے مکتوب اور کتاب دو... میں انہوں نے خاص طور پر شکریہ ادا کیا ہے لہذا کتاب صرف ایک اسلام کے بلند پایہ ہونے میں کیا شک ہے؟ ؏

والفضل ما شهدت به الاعداءُ

(۲) برق صاحب اس کو واضح الفاظ میں تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک دعا کو قرآن کریم کی آیت سمجھ لیا تھا اور دس بارہ[۱۲] مقامات میں الفاظ حدیث کا ترجمہ نافہمی میں غلط کر دیا تھا اور دو چار جگہ تنقید غلط ہو گئی تھی اگرچہ اغلاط اس سے کہیں زیادہ ہیں اور غلط تنقید بھی ان سے کئی جگہ سرزد ہوئی ہے صرف دو چار ہی مقامات نہیں ہیں لیکن اس سے یہ بات تو بالکل واضح ہو چکی ہے کہ برق صاحب کی رائے میں اصابت اور تحقیق نہیں بلکہ وہ باقرار خود نافہمی کا شکار ہو چکے تھے جس شخص کا اپنا اقرار یہ ہو کہ مجھ سے متعدد مقامات میں حدیث کے ترجمہ میں اور تنقید میں غلطی ہوئی ہے تو خود اس کو بھی یقین کر لینا چاہیئے اور دوسرے لوگوں کو بھی

اس امر کا اذعان کر لینا چاہیئے کہ نفس حدیث کے بارے میں بھی اس کی رائے یقیناً غلط ہے اور اس پر ہرگز اعتبار نہیں کیا جا سکتا اور جلد یا بدیر اس کو اپنی غلطی کا اقرار کرنا پڑے گا بشرطیکہ قسمت اور زیست نے ساتھ دیا اور توفیق خداوندی شامل حال رہی۔

(۳) حیض کی حالت میں مباشرت کی حدیثوں سے متأثر ہو کر حدیث کے بارے میں برق صاحب نے جو غلط نظریہ قائم کیا ہے وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یا تو انہوں نے عیسائیوں اور شیعہ وغیرہ کی صحبت اور کتابوں سے یہ تأثر لیا ہے اور یا کہیں مشن اسکول اور پادری صاحبان کی محفل سے وہ متأثر ہوئے ہیں کیوں کہ ایسی حدیثوں پر اعتراض کی بنیاد انہوں نے ہی قائم کی ہے اور وہی اس کے موجد اور کرتا دھرتا ہیں بجائے اس کے اگر وہ کسی ماہر استاد اور کامل کی صحبت حاصل کرتے تو ان کو ہرگز یہ باطل اور بے بنیاد رائے قائم کرنے کی حاجت پیش نہ آتی چونکہ ہم نے اس اعتراض کا مفصل جواب آگے کتاب میں دے دیا ہے اس لیے یہاں اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

ہم نے اس ایڈیشن میں وہ اغلاط جوں کی توں رہنے دی ہیں جو برق صاحب سے سرزد ہوئی ہیں اور جن پر ہم نے طبع اوّل میں تنقید کی ہے ہمارا مقصد ان کو فی الحال بدستور باقی رکھنے کا یہ ہے کہ ایک تو ناظرین کرام ان کو بخوبی ملاحظہ کر لیں کہ برق صاحب کی تنقید کا کیا پایہ اور اغلاط کا پس منظر کیا ہے؟ اور دوسری طرف ان کی کتاب میں لکھی ہوئی [illegible] بیانی بھی واضح ہو جائے کہ اُن سے دو چار جگہ ہی تنقید غلط ہوئی ہے۔ قارئین کرام [illegible] ملاحظہ کر لیں کہ اغلاط ان کی بتلائی ہوئی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں اور یہی حال ان کی غلط غلط تنقید کا ہے اور ہم نے جہاں ان کی اغلاط بدستور موجود ہیں طبع اوّل اور طبع [illegible] کا باقاعدہ حوالہ دیا ہے اور جس مقام پر انہوں نے اغلاط کو خارج کر دیا ہے وہاں بھی ہم نے اشارہ کر دیا ہے کہ اب ندارد یا اس کو مضم

کر گئے ہیں یا پی گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

رہا برق صاحب کا یہ سوال کہ کوئی صاحب میری تسلّی نہ کر سکے کہ حدیث حجت ہے یا وحی خفی ہے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے حدیث کی حجیّت کے دلائل تو ہم نے شوقِ حدیث میں بیان کر دیے ہیں جو انشاء اللہ جلدی طبع ہو جائے گی منصف مزاج آدمی اور مسلمانوں کے لیے تو وہ انشاء اللہ کافی ہوں گے رہے ضدی متعصب اور حدیث کے رد و انکار پر تُلے ہوئے تو ایسے لوگوں کے لیے اس جہان میں کوئی دلیل کار آمد نہیں ہے آخر نوح علیہ السلام کے زمانہ سے حضرت خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ تک حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے وحی الٰہی اس کے دلائل و براہین جو اپنے اپنے وقت منکروں کے سامنے پیش کیے ان کے حق ہونے میں کیا شبہ اور شک ہو سکتا ہے؟ خداوند کریم کی تعلیم ہو حضرات انبیاء کرام علیہم السّلام کی پاک زبانیں اور نیک دل ہوں بے لوث تبلیغ ہو شک پھر کس چیز کا؟ مگر نہ ماننے والے انبیاء کرام علیہم السلام کے روبرو یہ کہتے رہے کہ تم ہماری تسلّی نہیں کرا سکے اور کوئی واضح دلیل تم ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکے اس لیے ہم نہیں مانتے مثلاً حضرت ہود علیہ السلام کی قوم نے صاف لفظوں میں یہ کہا تھا کہ

قَالُوا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ؀	کہا قوم نے اے ہودؑ تو ہمارے پاس کوئی واضح دلیل لے کر نہیں آیا اور ہم نہیں چھوڑنے والے اپنے معبودوں کو تیرے کہنے پر اور نہیں ہم تجھ کو ماننے والے۔
(پ ۱۲ - ہود ۵)	

کیا سچ مچ یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ واقعی حضرت ہود علیہ السّلام نے قوم کے پاس کوئی واضح اور روشن دلیل پیش نہیں کی تھی حاشا وکلّا کسی مسلمان کے وہم میں بھی یہ بات آتی ہو کیونکہ اگر اپنے وقت میں حضرت ہود علیہ السّلام نے قوم کے

سامنے کوئی روشن اور واضح دلیل نہیں پیش کی تھی اور قوم کے باطل عقائد اور خیالات کی لاجواب براھین کے ساتھ پُر زور تردید نہیں کی تھی تو یہ کاروائی اس وقت اور کس نے پیش کی تھی؟ مگر کہنے والے برق صاحب کی طرح یہی کہتے رہے کہ تمہاری دلیل سے ہماری تسلی نہیں ہوئی۔ اس کا آخر دنیا میں کیا علاج ہو سکتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار مکہ نے نشانی طلب کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی انگلی کے اشارہ سے چاند دو ٹکڑے کر دیا سب نے آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا جس کا قرآن کریم اور متواتر احادیث سے ثبوت ہے مگر نہ ماننے والے یہ کہہ کر ٹال گئے کہ یہ جادو ہے ہم نہیں مانتے چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتا ہے کہ:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ○ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ○	قریب آگئی قیامت اور پھٹ گیا چاند اور اگر وہ دیکھتے ہیں کوئی نشانی تو ٹلا جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے پہلے سے چلا آتا۔
(پ ۲۷۔ القمر۔۱)	

ملاحظہ کیا آپ نے کہ نبی کے ہاتھ پر صادر شدہ معجزہ اپنی آنکھوں کے ساتھ انہوں نے دیکھا مگر صاف رد کر دیا اور جادو کہہ کر ٹال گئے۔ ہمیشہ سے منکرین کا یہ وتیرہ چلا آرہا ہے کہ وہ حق کو یہ کہہ کر ٹالتے رہے ہیں کہ ہمارے اطمینان کا اس میں کوئی سامان نہیں ہے اس لیے برق صاحب کی یہ بات انوکھی نہیں ہے ان شاء اللہ وہ ایک ایک صحیح حدیث کو تسلیم کریں گے جب کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے آ سامنے موجود ہوں گے اور اس وقت وہ مہلت بھی مانگیں گے اور اقرار بھی کریں گے مگر بے سود ہو گا کیونکہ مشہور ہے کہ ع

اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

الغرض برق صاحب کا یہ کہنا کہ حدیث وحی خفی نہیں بالکل باطل اور قطعاً

مردود ہے صحابہ کرامؓ سے لے کر اس وقت تک ہر مسلک اور ہر طبقہ کے مسلمان حدیث کو حجت بھی تسلیم کرتے آئے ہیں اور اس کو وحی بھی مانتے رہے ہیں اور اب بھی بحمداللہ تعالیٰ مانتے ہیں۔ باقی برق صاحب کا یہ کہنا کہ صحاح کی تمام روایات صحیح نہیں اس سے ان کی کیا مراد ہے؟ اگر صحاح سے بخاری مسلم اور صحیح ابوعوانہ وغیرہ کتابیں مراد ہیں جن کے مصنفین نے صحت کا التزام کیا ہے اور پوری امت مسلمہ نے ان کو صحیح کہا اور تسلیم کیا ہے تو برق صاحب کا یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ یہ کتابیں صحیح نہیں یا ان کی روایات صحیح نہیں ہیں اس لیے برق صاحب کی رائے اس سے بڑھ کر اور کوئی حقیقت نہیں رکھتی کہ ؎

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

اور اگر صحاح سے ابن ماجہ اور ترمذی وغیرہ کتابیں مراد ہیں تو بلاشک ان میں بعض روایتیں ضعیف کمزور بلکہ موضوع بھی ہیں مگر ان کے ضعف سے صحیح روایات پر کیا زد؟ کیونکہ صحیح صحیح ہیں اور ضعیف ضعیف اور ان کتابوں کا صحاح میں شمار کرنا تغلیباً ہے کہ ان کی اکثر حدیثیں صحیح ہیں اور ان میں معلول اور کمزور روایتیں بھی موجود ہیں اور ہم بھی اس کے قائل ہیں لیکن برق صاحب جس تلبیس سے کام لے رہے ہیں وہ اہلِ علم و تحقیق کے شایانِ شان نہیں ہے۔ ع

خرد مختصر مثلِ موجِ نفس ہے!

مسجد اقصیٰ

برق صاحب نے اپنے مکتوب میں بھی اس کا ذکر کیا ہے اور کتاب میں بھی کہ انسائیکلوپیڈیا برطانیکا میں لکھا ہے کہ بیت ایل یوروشلم سے گیارہ میل دور ہے۔ وہاں مسجد اقصیٰ کا کیا سوال؟ چنانچہ وہ لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولوی

سرفراز خاں خطیب گکھڑ نے بات نہایت معقول کہی لیکن بیت المقدس یوروشلم میں ہے اور بیت ایل گیارہ میل دور شمال میں تھا لہذا اس کی بنیادوں پر مسجد اقصی کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر اپنے اس دعوی پر انسائیکلوپیڈیا کا ایک مجمل حوالہ بھی ذکر کیا ہے (محصلہ دیکھئے دو اسلام طبع ششم ص۱۹۷ و ص۱۹۸)

الجواب :۔ ہم نے کتاب میں برق صاحب کی غیر محرف آسمانی کتابوں کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ مسجد اقصی کی ابتدائی اور معمولی تعمیر (کعبہ کی تعمیر کے چالیس سال بعد) حضرت یعقوب علیہ السلام نے کی تھی اور اس پر ہم نے مؤرخ اسلام حافظ ابن کثیرؒ کا حوالہ بھی کتاب کے ص۱۰ پر دیا ہے۔ اس کے برعکس نہ معلوم انسائیکلوپیڈیا کا وہ مضمون نگار کون ہے؟ مسلم ہے یا غیر مسلم؟ غیر مسلموں نے اور خصوصیت سے عیسائیوں نے جس طرح اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے وہ کس غیور اور اہل علم مسلمان سے پوشیدہ ہے؟ جن لوگوں نے بقول برق صاحب آسمانی صحائف کا حلیہ بگاڑ دیا۔ الخ اور جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کچھ سے کچھ کر دیئے ایسے محرفین کی جھولی میں پناہ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ برق صاحب بھی عجیب مخلوق ہیں کہ بخاری اور مسلم کی حدیث کی تفسیر اور تطبیق کے لیے نہ تو شراح حدیث کی بات مانتے ہیں اور نہ مؤرخین اسلام کی ہاں اگر مانتے ہیں اور وہ بھی اس صحیح حدیث کو رد کرنے کے لیے تو انسائیکلوپیڈیا برطانیکا کی تحقیق۔ افسوس ہے اس اسلام دشمنی اور عیسائیت پرستی پر۔ حافظ ابن کثیرؒ کا حوالہ تو اپنے مقام پر آئے گا دو حوالے ہم یہاں اور عرض کئے دیتے ہیں تاکہ معاملہ صاف ہو جائے۔

حافظ شمس الدین ابن القیمؒ (المتوفی ۷۵۱ھ) اسی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

وقد اشکل ھذا الحدیث علی — جس شخص نے اس حدیث کی مراد نہیں

من لم یعرف المراد بہ فقال	سمجھی اس پر اشکال پیش آیا ہے اُس
معلوم ان سلیمان بن داؤد الذی	نے کہا ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیھما
بنی المسجد الاقصٰی وبینہ و	السّلام نے مسجد اقصٰی کی بنیاد رکھی تھی اور
بین ابراھیم اکثر من الف	ان کے اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان
عام وھذا من جھل ھذا	ایک ہزار سال سے زیادہ زمانہ گزرا ہے
القائل فان سلیمان انما کان	لیکن یہ اشکال اس قائل کی جہالت
لہ من المسجد الاقصٰی تجدیدہ	کا نتیجہ ہے کیونکہ حضرت سلیمانؑ نے
لا تأسیسہٗ والذی اسسہٗ	مسجد اقصٰی کی تجدید کی تھی اس کی
ھو یعقوب بن اسحاق صلی اللہ	بنیاد تو حضرت یعقوب بن اسحاق علیھما
علیھما وسلم بعد بناء ابراھیم	السلام نے حضرت ابراہیمؑ
الکعبۃ بھذا المقدار ۔	کے کعبہ بنانے کے چالیس
(زاد المعاد ج ۱ ص ۸ طبع مصر)	سال بعد رکھی تھی ۔

اس حوالہ سے یہ بات آفتاب نیم روز کی طرح روشن ہوگئی ہے کہ مسجد اقصٰی کی بنیاد حضرت سلیمان علیہ السلام نے نہیں رکھی بلکہ اس کی تجدید اور تعمیر نو کی خدمت انہوں نے انجام دی تھی اس کی بنیاد تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے رکھی تھی اور یہ بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کعبہ بنانے کے چالیس سال بعد تھی۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ (المتوفی ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء) جن کی تعریف برق صاحب نے نام لے کر دو اسلام ص۲۴ طبع ششم میں کی ہے ، حافظ موصوفؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہوئے ساتھ سو فیصدی ان سے اتفاق کرتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

فان سلیمانؑ انما کان لہ من المسجد	بے شک حضرت سلیمان علیہ السلام نے

الاقصیٰ تجدیدہ لا تأسیسہ	مسجد اقصٰے کی تعمیر نو کی تھی اس کی بنیاد انہوں
والذی اسسہ ھو یعقوب	نے نہیں رکھی تھی اس کی بنیاد تو حضرت یعقوب
بن اسحاق بن ابراھیم (علیھم السلام)	بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام نے رکھی تھی
بعد بناء ابراھیم الکعبۃ بھذا	اور یہ بنیاد انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ
المقدار انتھی	السلام کے کعبہ بنانے کے چالیس سال
(فتح الملہم ج ۲ ص ۱۱۴)	بعد رکھی تھی۔

لہذا برق صاحب سے التماس ہے کہ وہ خس و خاشاک کا پل نہ تعمیر کریں اور نہ تنکوں کا سہارا لیں بلکہ اس صحیح حدیث کو اور اس کی تطبیق میں مؤرخین اسلام نے جو کچھ فرمایا ہے اس کو تسلیم کر لیں تورات وغیرہ سے بھی یہی کچھ ثابت ہے اور تاریخ اسلام اور شراح حدیث بھی یہی کچھ فرماتے ہیں اور برق صاحب نے بھی اس کو معقول بات سے تعبیر کیا ہے اور تاریخ اسلامی کے ان ٹھوس واقعات کو محض اپنی عقل نارسا سے نہ ٹکرائیں اور نہ عیسائیت کے اتنے گرویدہ ہو جائیں کہ اہل اسلام کی صحیح تاریخ کو چھوڑ کر عیسائیوں کے ناولوں اور افسانوں پر یقین رکھنے پر اتر آئیں مگر اے کاش کہ ؏

کوئی ناصحِ چمن یہ راز سمجھا دے تجھے

معذرت

کتاب صرف ایک اسلام طبع اوّل عرصہ سے ختم ہو گئی تھی اور اس کی مانگ ملک کے ہر گوشہ سے اور ہر مسلک اور ہر طبقہ کے حضرات کی طرف سے شدت کے ساتھ جاری تھی لیکن ان حضرات کا مطالبہ جلدی پورا نہ ہو سکا جس کی ہم معذرت چاہتے ہیں اور اس کے دو سبب تھے اوّل یہ کہ جب، برق صاحب کا مکتوب موصول ہوا کہ طبع جدید میں آپ کا خصوصی طور پر شکریہ بھی ادا ہو گا اور کتاب کو اغلاط اور غلط

تنقید سے پاک بھی کردیا جائے گا تو ہم منتظر تھے کہ برق صاحب کیا رویہ اختیار کرتے ہیں؟ دو تین مرتبہ لاہور سے پتہ بھی کرایا گیا لیکن برق صاحب کی جنس منڈی میں دیر سے آئی اس لیے ہم بھی مجبوراً دیر سے کتاب پیش نظر شائع کر رہے ہیں اور دوم یہ کہ راقم تعلیمی اور تدریسی مصروفیات میں کچھ ایسا مصروف رہتا ہے کہ سر کھجلانے کی فرصت بھی بعض اوقات نہیں ملتی بارہا کتاب پر نظر ثانی کا ارادہ کیا مگر فرصت نہ نکل سکی۔ اب جب کہ مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے اسباق اور گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ گکھڑ کے درس قرآن سے عید الاضحیٰ وغیرہ کی تعطیلات ہوئیں تو پانچ چھ دن کا مختصر سا وقفہ اس کی نظر ثانی کے لیے بمشکل نکالا گیا اور اب اس کو قارئین کرام کی خدمت میں میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے اللہ تعالیٰ اس کو راقم اور تمام مستفیدین حضرات کے لیے نجات اُخروی کا ذریعہ بنائے آمین ثم آمین۔

۱۳ ذوالحجہ ۱۳۸۳ھ
۲۶ اپریل ۱۹۶۴ء

احقر
ابُو الزاہد محمد سرفراز خان صفدر
خطیب جامع گکھڑ و مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

دیباچہ طبع اول

عرصہ سے یہ خیال تھا کہ غلام جیلانی صاحب برق کی کتاب دو اسلام کی تردید میں منصفانہ اور ناقدانہ رنگ میں ایک کتاب تالیف کی جائے جس میں ان کی ایک ایک غلطی و خود فریبی، خیانت و جہالت کو طشت از بام کر کے عام مسلمانوں کو آگاہ کر دیا جائے تاکہ وہ دام ہمرنگ زمین سے بچ سکیں اور اپنے محبوب اور آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کی حقیقی قدر و قیمت ان کو معلوم ہو سکے اور برق صاحب نے قدم قدم پر مکر و فریب تأویل و تحریف سخن سازی اور کھینچ تان کے جو اوزار استعمال کیے ہیں ان کی حقیقت بھی آشکارا ہو جائے مگر دینی و تدریسی مشاغل اور دنیوی علائق کچھ ایسے مانع ثابت ہوئے کہ یہ خیال عزم مصمم کی شکل اختیار نہ کر سکا حکومت پاکستان کی شاہانہ عنایت اور خاص نوازش سے جب راقم الحروف کو بسلسلہ تحریک ختم نبوت جیل میں زندگی کا کچھ حصہ بسر کرنے کا موقع جو حاصل ہوا تو اس سے جہاں اور بہت سے اخلاقی و روحانی علمی و تحقیقی فوائد حاصل ہوئے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کتاب زیر نظر صرف ایک اسلام کی تالیف و ترتیب کا اکثر (بلکہ تقریباً سارا) حصہ اسی فرصت کا ایک ثمرہ اور نتیجہ ہے اور اس کتاب کو (نیو سنٹرل جیل ملتان میں ۱۵ محرم ۱۳۷۳ھ ۲۹ ستمبر ۱۹۵۳ء کے لگ بھگ) حضرت الاستاذ المحقق، المدقق شیخ المعقول والمنقول مولانا عبدالقدیر صاحب

کیمبلپوری دامت برکاتہم نے (جب کہ آپ بھی نیرنگیٔ تقدیر سے وہاں تحریک کے سلسلہ میں ہی محبوس تھے) بہت پسند فرمایا اور بعض مقامات میں اصلاح بھی فرمائی۔ کسی کتاب یا مضمون پر ناقدانہ اور باحثانہ تحقیق کے لیے جن وسائل و ذرائع اور ذخیرۂ کتب کی ضرورت ہو سکتی تھی اُس برزخ کی زندگی میں ہم اُس سے قطعاً محروم تھے اور اب دوستوں کے شدید تقاضا کے پیش نظر کتاب قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے انتہائی عدیم الفرصتی کی وجہ سے صرف بعض مقامات کی اصلاح ہی کی جا سکی ہے باقی کتاب بحالہٖ چھوڑ دی گئی ہے مزید برآں اپنی علمی بے بضاعتی کے پیش نظر لغزشوں اور فروگذاشتوں کا صادر ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔ لہٰذا اپنی غلطیوں پر اعتذار کرنا انسانی فرض سمجھتا ہوں۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ

ابُوالزاہد محمّد سرفراز خاں صفدر

خطیب جامع گکھڑ ضلع گوجرانوالہ (پاکستان)

۱۹ ذوالقعدہ ۱۳۷۴ھ ——— ۱۱ جولائی ۱۹۵۵ء

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ الْاِنْسَانَ وَعَلَّمَهُ الْبَیَانَ وَاَرْسَلَ
لِهِدَایَةِ الْاِنْسَانِ رُسُلًا وَّاَنْزَلَ عَلَیْهِمُ الْوَحْیَ وَالْکِتَابَ
وَالْحِکْمَةَ وَاجْعَلْنَا مِنْ اُمَّةِ اَفْضَلِ الرُّسُلِ مُحَمَّدٍ صَلَّی
اللّٰهُ عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ وَسَرَارِیْهٖ وَسَلَّمَ اَجْمَعِیْنَ ہ

(۱) اِنسان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ہر طرح سے آزاد رہنے کو پسند کرتا اور قید و بند کی زندگی کو اپنی خواہشات اور اہواء کے پورا کرنے میں مزاحم پاتا ہے وہ ہر ایسی زندگی کی طرف لپک کر آگے بڑھتا ہے جو اس کو ہر قسم کی جسمانی و روحانی عقلی اور ذہنی آزادی کا پروانہ دیتی ہو اور ہر اس زندگی کے تسلیم کرنے میں تامل اور پس و پیش کرتا ہے جو اس کو ایک خاص دائرہ عقائد و اعمال، اخلاق اور معاملات میں مقیّد کر دینا چاہتی ہو اس عمومی فطرت کے ساتھ اُن وساوس اور خطرات اور شکوک و شبہات کو بھی اگر ملا لیا جائے جو ہر وقت عدّو مبین ابلیس لعین القا کرتا ہے تو بدی کی گاڑی اور تیز ہو جاتی ہے اور اس نام نہاد دورِ تہذیب و تمدّن میں عقائد و اعمال، اخلاق و معاملات سے جو کھلی چھٹی ملی ہے اس کی مثال قرونِ اُولیٰ میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی اِس پُر فِتَن دور میں عقلی اور ذہنی آزادی کا یہ عالم ہے کہ ہر وہ چیز جو از قسم معجزہ یا کرامت ہے یا جس میں خرقِ عادت کا کہیں ذکر آجاتا ہے

یا جو قادرِ مطلق کی قدرت کا ایک خاص نمونہ ہوتی ہے اس کو یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ یہ خلافِ عقل ہے، سمجھ سے بالاتر ہے۔ نظام قدرت کے مخالف ہے، سائنس کے اصول سے ٹکراتی ہے وغیرہ وغیرہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو اللہ کی انتہائی قدرت پر اور اس کے نظام پر پورا عبور حاصل ہے اور یہ اس کے ٹھیکہ دار اور اس پر حاوی ہیں (معاذ اللہ) اور منکرین حدیث بھی اکثر حالات میں حدیث سے محض اس لیے انکار کرتے ہیں کہ وہ ان کے نفس کی آسودگی کے لیے ذرا بھی گنجائش نہیں چھوڑتی یہ تو ان کے ضمیر، سیرت، کردار، اخلاق، نفس اور پوری زندگی کے لیے سخت آزمائش ہے یہ گویا اس کے لیے پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بستر ہے اور یہاں ہی سے آپ کو حق و باطل کی کشمکش اور اسلام و جاہلیت کی مستقل آویزش و پیکار نظر آجائے گی اور اللہ والے صرف یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے خزاں رسیدہ چمن میں پھر سے بہار آجائے۔ ؎

عجب کیا ہے کہ بیڑہ غرق ہو کر پھر ابھر آئے
کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

(۲) آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ایسا وقت آئے گا جس میں کچھ لوگ میری احادیث کا انکار کریں گے اور یہ کہیں گے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی کتاب بس ہے مزید کسی چیز کو ہم تسلیم نہیں کرتے (او کما قال۔ ابوداؤد جلد ۲ ص ۲۷۶ مسند احمد جلد ۶ ص ۸ ترمذی جلد ۲ ص ۹۱ وابن ماجہ ص ۳) اور کتاب اللہ کے تسلیم کا دعویٰ بھی صرف سطحی اور زبانی ہوگا درحقیقت ان کو کتاب اللہ سے بھی کوئی تعلق نہ ہوگا چنانچہ جناب رسول خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا یدعون الی کتاب اللہ ولیسوا منہ فی شیئ (ابوداؤد جلد ۲ صفحہ ۳۰۰ التاج الجامع للاصول جلد ۵ ص ۳۳۴) کہ وہ اللہ کی کتاب کی طرف دعوت تو دیں گے مگر ان کو اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کوئی تعلق

نہ ہوگا۔ منکرین حدیث کے دعوت الیٰ القرآن کا پسِ منظر ہم ایک مستقل کتاب میں عرض کریں گے انشاء اللہ العزیز۔ ہماری جانیں اور رُوحیں اُس صادق و مصدوق پر قربان کہ واقعی اور سچ مچ ایسا گروہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور جہاں آپ کی دیگر سینکڑوں اور ہزاروں پیش گوئیاں پوری ہوئی ہیں وہاں ایک یہ بھی پوری ہوئی ہے اگر ایسا فرقہ دنیا میں نہ آتا تو مشاہدہ کے طور پر ہمارے اطمینان اور ایقان میں شاید کمی رہتی ع

عدو شرّے برانگیزد کہ خیرِ مادراں باشد

(۳) اس فرقہ نے مسلمانوں کی سادگی سے فائدہ اٹھاتے ہوتے ان تمام اسباب کو جو مسلمانوں کے تنزل و ادبار اور دنیا میں ان کی ذلّت اور رسوائی کے کسی وقت بھی ہونما ہوئے ہیں، حدیث اور محدثین کے سر تھوپ دیا ہے اس فرقہ کے دیگر افراد عموماً اور برق صاحب[1] خصوصاً (جو یورپ کی زرق و برق سے اس قدر متاثر اور مرعوب ہو چکے ہیں اور ان کی نگاہ مادی ترقیات کو دیکھ کر اس قدر خیرہ اور چکا چوند ہو چکی ہے کہ ان کو روحانیت کے جملہ مسائل از قسم ناممکنات نظر آتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اشیاء کی خوبی و خرابی کا معیار درحقیقت ان کے زاویۂ نگاہ اور نقطۂ نظر میں صرف اپنی عقل نارسا ہے) اس کے مدعی ہیں کہ مسلمانوں کو ترقی سے صرف حدیثی اسلام نے روکا ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ کونسی صحیح احادیث ہیں جن میں مسلمانوں کو تجارت، زراعت جائز ملازمت اور دیگر اسباب ترقی سے منع کیا گیا ہے؟ کیا ان مختلف شعبوں پر کتب احادیث میں سیر حاصل بحث نہیں کی گئی؟ اور مسلمانوں کو بام عروج پر چڑھنے کی تلقین نہیں کی گئی؟

---

[1] دیکھئے دو اسلام صـ۲۶۶ طبع اوّل سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اس بُری حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ اس کا جواب صرف ایک ہے کہ مُلّا اور اُس کا حدیثی اسلام اھ اور اب اشاعت ششم میں یہ الفاظ ہیں کہ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ مُلّا اور اس کا اسلام اھ صـ۲۶۹ دو اسلام

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نہ تو حدیث نے ترقی سے منع کیا ہے (بلکہ اُس نے ترقی کرنے اور دنیا میں عدل انصاف اور خوشحالی پھیلانے کی پوری تلقین کی ہے) اور نہ حدیث کا تسلیم کرنا ترقی کے دروازے بند کرتا ہے اور نہ تسلیم حدیث اور ترقی میں کوئی عقلی اور منطقی تضاد ہے۔ یہ وتیرہ اس فرقہ نے محض مادہ پرست دنیا کو خوش اور اپنے سفید فام اور مغربیت زدہ آقاؤں کو راضی کرنے اور خود اسلام کی قیود سے آزاد ہو کر اپنی خواہشات پورا کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ مسلمانوں کے ذلیل اور خوار ہونے کا صرف راز یہی ہے کہ انہوں نے اپنے برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث سے گریز کرکے ضلالت اختیار کی ہے تو یہ زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ تاریخ اسلام کے ہزاروں واقعات اس پر شاہد عدل ہیں اور کوئی منصف مزاج اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

(۴) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلے جو قومیں گذر چکی ہیں ضرور تم ان کے سارے طریقوں اور چالوں کی ہو بہو پیروی کرو گے یعنی ان کی ساری گمراہیاں اختیار کر لو گے صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کیا وہ قومیں یہود اور نصاریٰ ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا ہاں اور کون ہے؟ (بخاری ج ۲ ص ۱۰۸۸ و مسلم ج ۲ ص ۳۳۹ وغیرہ) آپ کا یہ ارشاد جس طرح پورا ہوا کیا اس میں کسی کو ایک رائی برابر شک ہو سکتا ہے؟ کلمہ پڑھنے والوں نے نصاریٰ کی کیسی تقلید کی؟ عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات، صورت سیرت گفتار کردار نشست و برخاست اور فیشن وغیرہ، کون سی چیز ہے جس میں نصاریٰ کی خصلت او نقل نہیں اُتاری گئی؟ برق صاحب اور اُن کے ہمنوا خود تو مغربی آقاؤں کی چال ڈھال کو مرغوب سمجھتے ہیں اور حدیث کا انکار کر کے وہ برائے نام اسلام کا پھندہ بھی گلے سے اُتار پھینکنے کے درپے ہیں جو رسمی اور اتفاقی طور پر مسلمان گھرانوں میں تولّد سے اُن کو حاصل ہوا ہے، فقہ تاریخ اور تفسیر پہلے ہی

سے اُن کو یقین نہیں ہے انہوں نے حدیث کا انکار کر کے قرآن کریم کو بھی اپنی مرضی پر ڈھال کر ایک نیا راستہ اپنے لیے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اختیار کر رکھا ہے اور برائے نام قرآن کی دعوت بھی دیتے ہیں تاکہ مسلمانوں سے رشتہ کٹ بھی نہ جائے ع

شیخ بھی خوش رہے شیطان بھی ناراض نہ ہو

بلکہ برق صاحب عیسائیوں اور یہودیوں پر اتنے گرویدہ اور شیدائی ہیں کہ ان کو قرآن کے رُو سے مسلمان بتلاتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ

اسلام کسی زبانی اقرار (یعنی کلمۂ طیّبہ و کلمۂ شہادت یا ایمان مجمل وغیرہ صفدر) کا نام نہیں بلکہ نیکی کا نام ہے اگر ایک عیسائی نیکی کر رہا ہے تو وہ قرآن کے رُو سے مسلمان ہے رسول و قرآن کا صحیح پیرو وہی ہے جو نیک ہو نہ وہ جو کلمہ پڑھ کر سارے جہاں کی بدمعاشیاں کرتا پھرے آپ کے ہاں اسلام چند عقائد (مثلاً اقرار توحید و رسالت اور معاد وغیرہ صفدر) کا نام ہے اور قرآن کے نزدیک صرف نیکی کا اس لیے خدا اور رسول کا صحیح پیرو وہ ہے جو ان احکام پر عمل کر رہا ہو خواہ اس پر عیسائیت کا لیبل لگا ہؤا ہو یا یہودیت کا نہ وہ جو خدا اور رسول کا صرف زبانی قائل اور عملاً کافر انتہٰی بلفظہٖ (دو اسلام طبع اوّل ص۱۹۳ و ص۲۰۷ طبع ششم)

جو شخص مسلمان ہو کر خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرے یا بدمعاشی کرتا پھرے اس کی جتنی بھی تردید کی جائے بجا ہے لیکن وہ کونسا اسلام ہے جس میں زبان کا اقرار بھی ضروری نہیں اور اس کے بتلائے ہوئے اہم اور بنیادی عقائد بھی اس کی تعلیم میں شامل نہیں ہیں؟ وہ کون سا قرآن ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ وہ شخص بھی مسلمان ہے جس پر نمایاں طور پر عیسائیت اور یہودیت کا لیبل لگا ہؤا ہو وہ کون سا قرآن ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہو کہ کلمہ کا اقرار نیکی نہیں اور توحید، فرشتوں اور رسولوں اور

یوم آخرت پر ایمان لانا وغیرہ وغیرہ عقائد نیکی سے خارج ہیں؟ وہ کون سا قرآن ہے جس کی تعلیم کے رُو سے اُن بنیادی امور سے قطع نظر کرتے ہوئے نہ صرف عیسائی مسلمان ہوسکتا ہے بلکہ قرآن و رسول کا صحیح پیرو بھی وہی ہوسکتا ہے؟ ہم برق صاحب کے مشکور ہوں گے اگر وہ اس گتھی کو سلجھادیں دیدہ باید، ناظرین کرام حیران ہوں گے کہ اگر کلمہ طیبہ و شہادت توحید و رسالت و معاد وغیرہ عقائد بھی برق صاحب کے نزدیک نیکی نہیں تو آخر نیکی کیا چیز ہوگی؟ سو عرض کر دیتے ہیں۔ برق صاحب کے نزدیک وہ نیکی جس پر عیسائی عمل پیرا ہے یہ ہے استنجا نہ کرنا، سر پر انگریزی وضع کے بال رکھنا، ٹخنوں سے شلوار اور پتلون کو نیچے لٹکانا، مونچھیں بڑھانا، ڈاڑھی منڈوانا، سُرمہ نہ لگانا، دستار نہ باندھنا اور مسواک نہ کرنا وغیرہ وغیرہ برق صاحب کے نزدیک نیکی ان امور کا نام ہے لیجئے برق صاحب کی زبانی ہی سُن لیجئے :-

اگر ہم مُلاّ کا (یعنی حدیث کا کیونکہ جن امور کا ذکر کیا گیا ہے وہ احادیث سے ثابت ہیں نیز نہ تو مُلاّ پر کوئی وحی نازل ہوئی ہے اور نہ کوئی مذہب اور خصوصاً امور مذکورہ کسی مُلاّ نے ایجاد کئے ہیں) مذہب قبول کرلیں تو پھر استنجا بھی اصول دین منڈا ہوا سر بھی رکن اسلام ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار (اور پتلون) بھی مذہبی فرض، منڈی ہوئی مونچھیں اور لمبی ڈاڑھی بھی جزو دین مسلمان کیا ہوا ایک اچھا خاصا جوکر بن کر رہ گیا کیا آپ ان لایعنی قیود میں جکڑا ہوا اسلام کسی انگریز کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ اگر آپ کسی نو مسلم انگریز کا سر مونڈ کر اور ایک موٹا سا پگڑ باندھ دیں، مونچھیں مونڈھ ڈالیں، ڈاڑھی ناف تک بڑھا دیں نیچے ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار پہنا دیں پگڑ میں مسواک ٹانک کر ساتھ تسبیح باندھ دیں اور آنکھوں میں سُرمہ ڈال کر اسے انگلستان بھیج دیں تو دو ہی نتیجے ہوں گے یا تو انگریز اسے جن سمجھ کر مار ڈالیں گے اور یا پھر

چڑیا گھر میں بند کر دیں گے (انتھیٰ بلفظہٖ دو اسلام طبع اوّل ص۱۱۴) اس بات کو جانے دیجیے کہ وہ کونسا "مُلّا (یا حدیث،) ہے جس نے ان امور کو اصولِ دین، رکنِ اسلام مذہبی فرض اور جزو دین کہا ہے؟ اس کو بھی جانے دیجیے کہ اسلام کا ہر حکم اصول دین اور رکن اسلام ہی نہیں ہوتا بلکہ بعض امور فروع اسلام واجب سنّت اور مستحب وغیرہ بھی ہوتے ہیں اور اس کو بھی چھوڑ دیجیے کہ وہ کونسا مُلّا ہے جس نے پگڑی میں مسواک ٹانک کر ساتھ تسبیح باندھی ہے؟ ان تمام امور سے قطع نظر کرتے ہوئے برق صاحب کا نظریہ دیکھیے کہ ان کے نزدیک نیکی کن امور کا نام ہے؟ اور مُلّائی قیود کون سے امور ہیں؟ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ برق صاحب اور ان کے ہمنوا دوست، مادہ پرست دنیا اور سفید فام آقاؤں کے کیسے دلدادہ ہیں کہ وہ ہر مسلمان کو انگریز کی شکل اور صورت میں ہی دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کے نزدیک نیکی اور بدی حسن اور قبح کا معیار ہی صرف یہ ہے کہ جس کو انگریز بہادر پسند کرے وہ نیکی اور جس کو وہ رد کر دے وہ بدی ہے اس فرقہ نے حدیث کو رد کرنے کا مسلک اختیار ہی صرف اس لیے کیا ہے کہ اسلام کے جس حکم پر ان کے سفید فام آقاؤں کو اعتراض ہو یا جس پر عمل پیرا ہونا مشکل ہو یا جو نفس کی آسودگی کے لیے رکاوٹ ہو یا جس حکم کی مصلحت اور علت خود اپنی سمجھ میں نہ آئے تو اس کو آسانی کے ساتھ دائرۂ دین سے خارج کیا جا سکے اور جو چیز ان کی من مانی زندگی میں رخنہ پیدا کرتی ہو اس کو ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ (العیاذ باللہ) اب ہم برق صاحب سے عرض کرتے ہیں کہ آپ ازراہِ انصاف یہ فرمائیں کہ بجائے اسلامی صورت اور سیرت کے اگر ایک شخص ڈاڑھی

لہ اب اشاعت ششم میں یہ ساری عبارت برق صاحب کو کالا سمجھ کر پی گئے ہیں تاہم غنیمت ہے کہ اپنی عقلِ نارسا کی خامی کو تو تسلیم کر لیا ہے ۱۲ ابوالزاہد۔

منڈھوا کر جیسے چھپلی ہوئی گنڈیری ہوتی ہے کہ زن فیشن کی مونچھیں رکھ کر (جو دور سے ایسے معلوم ہوتی ہیں کہ گویا ناک کے سامنے مکھی بیٹھی ہوئی ہے اگلے میں سانپ (نکٹائی) لٹکا کر منہ میں سگریٹ لے کر سر پہ ہیٹ رکھ کر اور ٹخنوں سے نیچے پتلون لٹکا کر (جیسے سارنگی پر غلاف چڑھا ہوا ہوتا ہے اور جس میں پیچھے سے چلتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ چوتڑ باتیں کر رہے ہیں) اور پاکٹ میں مسواک کی جگہ خنزیر کے بالوں کی ارُبرش ڈال کر دربرق صاحب لکھتے ہیں اصل الفاظ یہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ سور کے بال تیرہ سو برس کے بعد انسانی تمدن کا حصّہ بن جائیں گے اس لیے سور کو حرام کرتے وقت لحم الخنزیر کے الفاظ استعمال فرمائے یعنی سور کا گوشت حرام قرار دیا اور بالوں کے متعلق خاموشی اختیار فرمائی انتھیٰ بلفظہٖ جہانِ نو صلا۱۴۴) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دربار میں حاضر ہو تو کیا آپ ایسے شخص کو مسلمان اور اپنا اُمتی تصوّر فرمائیں گے؟ اور کیا آپ اس کو محبت کی نگاہ سے دیکھیں گے یا حقارت کی نگاہ سے اور کیا آپ یہ نہ فرمائیں گے کہ اس کو میری نگاہوں سے دُور کرو فَسُحقًا فَسُحقًا مسلمان کا فرض تو یہ ہے کہ وہ ہر بات میں اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرے اور آپ ہی کے قول اور فعل کو معیارِ زیست بنائے کیا برق صاحب، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی زندگی کا نمونہ اور معیار پسند کرتے ہیں یا ایک انگریز اور عیسائی کو دیکھئے کیا ارشاد ہوتا ہے؟ ع

نبی اپنا اپنا امام اپنا اپنا

برق صاحب کا اسلام کیا ہے؟ سُن لیجئے دوسری اقوام کے انبیاء پر ایمان لانا ان کے اسوہائے حسنہ پر چلنا ان کے مناقب بیان کرنا انہیں ہر لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم مرتبہ ثابت کرنا اور ان کی تعلیمات کو تعلیمات قرآن کہنا ہمارا کام تھا اور اسے کر رہے ہیں بعض غیر مسلم الخ بلفظہٖ (ایک اسلام صلا۲۴)

غیر اقوام کے انبیاء کون کون ہیں جن کو ہر لحاظ سے حضرت خاتم الانبیاء امام الرسل محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہم مرتبہ ثابت کرنا ہے۔ سُن لیں انبیاء مثلاً موسیٰؑ وعیسیٰؑ، ابراہیمؑ، محمدؐ، رامؑ و کرشن، سقراطؑ، کنفوشسؑ اور زرتشتؑ و بدھ علیہم السلام الخ بلفظہٖ ایک اسلام ص۲۵) گو ان تمام کو ہر لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہم مرتبہ ثابت کرنا حتیٰ کہ قرآن کریم اور ختم نبوّت کے ملنے میں بھی (العیاذ باللہ) یہ ہے برق صاحب کا اسلام۔ فواسفا جب تک کوئی شخص صمیم قلب سے یہ عقیدہ نہ رکھے گا کہ

؎ رُخِ مصطفےٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دوکان آئینہ ساز میں

تو بخدا ہرگز وہ مسلمان نہ ہوگا بلکہ برق صاحب تو جناب رسول خدا صلّی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تسلیم کرنا بھی اسلام کے لیے ضروری نہیں قرار دیتے چنانچہ لکھتے ہیں کہ یہ لوگ خدا و آخرت پر ایمان رکھتے تھے لیکن ہمارے رسول کی رسالت کے قائل نہ تھے۔ (بلفظہٖ ایک اسلام ص۴۶) دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ غیر مسلموں کے اعمال کو ضائع کرنے والے دوستو! پھر سُن لو وہ اپنے نیک اعمال کا پورا پورا [illegible] پائیں گے اور لوٹ کر لو کہ یہ اہل کتاب حضور علیہ السلام کی رسالت کے قائل نہیں تھے بلکہ اُن کا ایمان خدا و آخرت تک محدود تھا (بلفظہٖ ایک اسلام ص۴۷) یہ ہے برق صاحب کا اسلام جس کی تبلیغ کے لیے وہ کوشاں ہیں۔

⑤ محدثین کرامؒ نے حدیث کی جتنی چھان بین کی اور اپنی تمام عمریں اس کی حفاظت میں صرف کر دیں اور جس طرح بے لاگ تنقید انہوں نے کی وہ کس سے مخفی ہے؟ مگر منکرین حدیث کا سب سے زیادہ ٹھیک نشانہ ہی ان اکابر کا وجود ہے وہ طرح طرح سے ان کو کوستے ہیں اور دینی علوم سے ناواقف نوجوان طبقہ کی نگاہوں میں ان کو ذلیل اور حقیر کرنے کی محض اس لیے کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی محنت اور

کوشش کو خاک میں ملا دیا جائے آہ ؎

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
پیدا کیے فلک نے تھے جو خاک چھان کے

ان اکابر نے حدیث کے صحیح اور ضعیف ہونے کا جو معیار امت کے سامنے پیش کیا ہے دنیا کی کوئی مہذب اور متمدن قوم اس کا عشر عشیر بھی پیش نہیں کر سکتی ان اکابر نے ضعیف کمزور معلل منکر اور من گھڑت و جعلی حدیثوں کے لیے الگ کتابیں لکھ کر ان کو جمع کر دیا ہے تاکہ کسی پڑھے لکھے آدمی کو ایسی متروک حدیثوں سے شک اور شبہ پیدا نہ ہو مگر افسوس ہے کہ منکرین حدیث عموماً اور برق صاحب خصوصاً انہی کتابوں (مثلاً موضوعات ابن جوزیؒ اللآلی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعۃ تذکرۃ الموضوعات موضوعات کبیر وغیرہ وغیرہ) سے جعلی احادیث نقل کر کے حدیث پر اعتراض کرتے ہیں جب خود محدثین کرامؒ نے ان جعلی اور بناوٹی حدیثوں کو الگ کر کے رکھ دیا ہے تو پھر یہ کتنی بے انصافی ہے کہ ان کو صحیح احادیث میں خلط ملط کر کے صحیح حدیثوں کے پہلو بہ پہلو نقل اور بیان کیا جائے اور پھر ان مفروغ عنہا احادیث کو بیان کر کے معاملہ کو طول اور نطاق بیان کو وسیع کر دیا جائے اور اسی طرح کیا یہ انصاف کا خون نہیں کہ جن روات اور رجال کو محدثین کرامؒ نے تاریخ کی روشنی میں کذاب اور دجال ثابت کیا ہے ان کو درمیان میں لا کر عام مسلمانوں کو یہ مغالطہ دیا جائے کہ حدیث کے روات ایسے ہی ہوتے ہیں الغرض یہ تمام تر امور کسی متین اور سمجھ دار آدمی کی شان کے ہرگز مناسب نہیں ہیں مگر برق صاحب سے اس کی توقع بالکل بے سود ہے اور یہ شکایت صرف ہمیں ہی نہیں بلکہ ان کے بہی خواہوں کو بھی ہے چنانچہ دو اسلام کے مقدمہ ص۳۲ میں جناب قمر الدین صاحب قمر مدیر البیان لاہور لکھتے ہیں کہ راقم کو دو اسلام کے مصنف سے کئی جگہ سخت اختلاف ہے مسائل میں بھی

اور انداز بیان میں بھی ایسی تصنیف کے لیے جس سنجیدگی کی ضرورت ہے کہیں جگہ محترم مصنف اس کو ملحوظ نہیں رکھ سکے الخ تو ہم برق صاحب سے متانت اور سنجیدگی کی کیا امید رکھ سکتے ہیں ؟

(۶) یہ بات کسی پڑھے لکھے آدمی سے اوجھل نہیں کہ ہر زبان میں ایک لفظ کے کئی کئی معانی ہوتے ہیں اور ہر لفظ کا ایک ہی معنیٰ ہر مقام پر چسپاں نہیں ہوسکتا ہر لفظ کو اور اس کے مفہوم اور معنیٰ کو سمجھنے کے لیے سیاق و سباق متکلم اور سامع کے حال اور لب ولہجہ کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے یہ نہیں کہ جو لفظ کسی مقام میں ایک معنیٰ ادا کرتا ہو تو وہ ہر محل اور ہر مقام میں صرف وہی ایک ہی معنیٰ ادا کرے گا۔ بلکہ اس کے لیے قرائن سے اندازہ لگا کر ہی معنیٰ کیا جائے گا اس کی ہر زبان میں سینکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر ہم صرف اُردو کی ایک عبارت کو بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ عبارت یہ ہے کیا بات ہے یہ جملہ کبھی استفہام اور سوال کے لیے آتا ہے کیا بات ہے ؟ مثلاً جواب یہ ہوگا کچھ بھی نہیں اور یہ جملہ کبھی لب ولہجہ کی درشتی کے ساتھ انکار کے لیے آتا ہے اگر کوئی آدمی کوئی بات کر رہا ہو اس سے سوال کیا جائے کیا بات ہے؟ تو وہ اس سوال کو ناپسند تصور کرتے ہوئے کہہ دے گا کیا بات ہے ؟ یعنی کچھ بھی نہیں یہی جملہ پہلے سوال تھا اب جواب ہے اور وہ بھی انکار اور درشتی کی شکل میں۔ اور کبھی یہی جملہ تعجب کے لیے آتا ہے اگر کسی آدمی کا کوئی ہنر اور کمال بیان کیا جائے تو کہا جاتا ہے اس کی کیا بات ہے یعنی وہ ایسا باکمال اور ہنرمند ہے کہ اس کی کیا پوچھ رہے ہو ؟ جملہ صرف ایک ہی ہے مگر ہر مقام پر ایک نیا معنیٰ دریغ ادا کرتا ہے یہ تو خیر اُردو کا جملہ ہے عربی زبان میں جو سب زبانوں سے وسیع تر اور ادق ہے اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں برق صاحب اور ان کے ہمنوا دوستوں نے جہاں کہیں احادیث پر اعتراضات کئے ہیں وہ یا تو عربی کے قواعد اور ضوابط ...

محض نا آشنا ہیں اور یا وہ خیانت کرتے ہوئے سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں جن سے خود ان کو بھی اور پڑھنے والوں کو بھی اکثر مغالطہ لگ جاتا ہے اور ہماری اس کتاب کو پڑھنے والے حضرات بخوبی ایسے مقامات سے آگاہ ہوجائینگے جہاں برق صاحب نے اصلی اور صحیح معنی چھوڑ کر بے محل اور بے موقع معنیٰ لے کر اس پر اعتراض کیا ہے اور کسی مقام میں برق صاحب اور ان کے احباب نے دو حدیثوں کے سطحی اور ظاہری تعارض کو حقیقی تعارض سمجھ کر حدیث کا انکار اور اس سے ... کیا ہے حالانکہ ایسے ظاہری اور سطحی تعارض کی مثالیں خود قرآن کریم میں موجود ہیں اور کوئی مسلمان درحقیقت ان میں تعارض تسلیم نہیں کرتا بلکہ جمع و تطبیق سے اس مسئلہ کو حل کرتا ہے یہی حال احادیث کے ظاہری تعارض کا ہے۔

(۷) یوں معلوم ہوتا ہے کہ برق صاحب نے بعض حوالے عیسائیوں، آریوں اور شیعوں کے اخبارات یا رسائل میں دیکھ کر درج فرما دیئے ہیں اگر اصل کتابوں کی طرف رجوع کرتے تو بہت سے مقامات میں ان کو اپنی غلطی کا خود احساس ہو جاتا بشرطِ فہم و انصاف نیز انہوں نے بعض مسائل کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور بہت سی عبارات میں قطع و برید سے بھی کام لیا ہے اور شاید عمداً اور بعض حوالوں میں صفحات اور ہندسے بھی غلط درج کئے ہیں لیکن ہم نے ان کی تصحیح کو غیر ضروری سمجھ کر ان کو نظر انداز کر دیا ہے اور ان کی جملہ عبارات میں حوالے جوں کے توں چھوڑ دیئے ہیں اور کتابوں کے ورق الٹنے میں صرف ایک مقصد اُن کے پیش نظر رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ حدیث کی تائید میں اگر پہاڑ نظر آئے تو اس سے آنکھیں بند کر لیں اور اس کے خلاف ایک بال کی ذرا سی نوک بھی نظر آئے تو اس کو پہاڑ بنا کر اُن مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیں جو بیچارے اصل مآخذ تک نہیں پہنچ سکتے اور جن کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ اُن

کے نمائشی پہاڑوں کی حقیقت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جہاں بحث کا یہ طریقہ اور تحقیق کا یہ معیار ہو وہاں کسی سنجیدہ بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی مگر ہم نے اصلاح اور تذکیر کے مقصد کے پیشِ نظر ان کی ایک ایک غلطی کا راز فاش کیا ہے۔ اگر وہ دو اسلام نہ لکھتے تو ہم بھی خاموش رہتے اور ؏

نہ کھلتے راز سربستہ نہ یہ رسوائیاں ہوتیں

اس کتاب میں ان کی تحقیق و تدقیق اور نفسی میلانات اور رجحانات کی پردہ دری ضرور ہوگی مگر بغیر پردہ دری کے درون پردہ کا نظارہ کس نے کیا ہے؟ ہم برق صاحب سے گذارش کریں گے کہ آپ حدیث فقہ اور تفسیر کے لٹریچر کو جعلی ٹھیرا دیں گے مگر قرآن کریم کی صریح آیات کا آپ کے پاس کیا علاج ہے؟ کن کن الفاظ کا مفہوم بدلیں گے؟ اور کن کن عبارتوں کو اُدھیڑیں گے؟ کہاں تک خدا کے کلام میں اپنا معنیٰ بھریں گے؟ مگر صد افسوس کہ دو قرآن میں یہ سب کچھ کیا گیا ہے۔ اگر ان میں خوفِ خدا ہوتا تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے۔

⑧ ہم نے جو امور دو اسلام کی تنقید پر ضروری معلوم ہوتے تھے مقدمہ میں درج کر دیے ہیں اگرچہ ابھی بہت کچھ باقی ہے خیال یہ تھا کہ ہم مقدمہ میں سب کچھ کہہ دیں گے کہا بھی مگر کچھ بھی نہ کہا چند اصول اور بنیادی باتیں اور بھی عرض کرنی تھیں مگر ہم طوالت کے خوف سے ان کو نظر انداز کرتے ہیں اگر آپ کو اس کی مزید تحقیق مطلوب ہو تو راقم السطور کی کتاب "شوقِ حدیث" کا مطالعہ کریں جس میں اثباتِ حدیث اور اس کی حجیت کو عقلی اور نقلی دلائل سے مبرہن کیا گیا ہے۔ اور منکرینِ حدیث کو دندان شکن جوابات دیے گئے ہیں۔

⑨ برق صاحب نے اپنی کتاب کو بیس بابوں پر تقسیم کیا ہے مگر ہم نہ تو ترتیب وار ان کے جملہ ابواب کی تردید ہی کریں گے اور نہ ابواب مرتّب کرنے کی ضرورت

سمجھتے ہیں اور نہ ہم دو اسلام کے صفحات اور مسائل کی ترتیب کو پیش نظر رکھیں گے ہم صرف ان کے اہم اور زیادہ وزنی اعتراضات کو ان کے اپنے الفاظ میں نقل کر کے ان کے جوابات عرض کر دیں گے اور پھر اعتراضات کی حقیقت خود معلوم ہو سکتی ہے۔

(۱۰) کوشش کی جائے گی کہ برقی صاحب کی طرح بازاری زبان اور سوقیانہ الفاظ استعمال نہ کیے جائیں مگر آخر ہم بھی انسان ہیں اگر کہیں اس کے خلاف واقع ہو تو نہ

محتسب خم شکست و من سر او

السّن بالسّن والجروح قصاص

کے پیش نظر اس کی علت بھی انہیں کی کوئی عبارت سمجھئے اور سہل انگاری و کرم فرمائی سے کام لیتے ہوئے یہ کہہ کر گذر جائیے کہ ع

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

ابو الزاہد

محمد سرفراز خاں صفدر

۷ ار محرم ۱۳۷۳ھ

۲۷ ستمبر ۱۹۵۳ء

نیو سنٹرل جیل ملتان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ ؕ

برق صاحب کی کتاب دو اسلام کے جملہ ابواب اور سب پیش کردہ دلائل اور اعتراضات کے جوابات عرض کرنا ہم غیر ضروری خیال کرتے ہیں بلکہ تضیع وقت کے مترادف سمجھتے ہیں۔ ہاں البتہ ایک خاص ترتیب کے ساتھ ان کی طرف سے پیش کردہ وزنی اعتراضات کے جوابات ہم عرض کر دیں گے تاکہ عام لوگ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔

برق صاحب کا حدیث پر پہلا اعتراض

ایک اور حقیقت ملاحظہ ہو۔ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے جبرائیل[1] کو دیکھا تھا اس کے چھ سو پر تھے (بخاری ۲ ص ۱۴۰) صرف ابن مسعودؓ میں کیا خوبی تھی کہ انہیں جبرائیل نظر آیا کسی اور صحابی کو کیوں دکھائی نہ دیا؟ چھ سو پر آپ نے کیسے گن لیے تھے؟ اور جبرائیلؑ کے لیے پروں کی ضرورت ہی کیا تھی؟ وہ ایک نوری جسم ہے پرواز نور کی فطرت ہے جس طرح ہوا آگ اور بادلوں کو پروں کی ضرورت نہیں ہوتی اسی طرح نور بھی وسائل پرواز سے بے نیاز ہوتا ہے۔ (انتہیٰ بلفظہ دو اسلام ص ۲۴۸)

جواب:۔ برق صاحب نے روایت نقل کرتے وقت خیانت یا جہالت سے کام

---

[1] برق صاحب نے اس فاحش غلطی کو تسلیم کر لیا ہے اور یہ اعتراض اشاعت ششم میں حذف کر دیا ہے۔ ۱۲ ابوالزاہد

لیا ہے اِس لیے کہ حضرت ابنِ مسعودؓ کی روایت میں ایسا کوئی جملہ اور لفظ موجود نہیں ہے جس کا معنیٰ یہ ہو کہ میں (یعنی ابن مسعودؓ) نے حضرت جبرائیلؑ کو دیکھا تھا۔ اصل روایت جو اُن سے مروی ہے وہ یوں ہے انه رأیٰ جبرائیل الخ انہوں نے حضرت جبرائیلؑ کو دیکھا تھا وہ کون تھے؟ سو اس کی توضیح خود ابن مسعودؓ کی روایت نے کر دی ہے عن عبد اللہؓ بن مسعود ان محمد صلی اللہ علیہ وسلم رأیٰ جبرائیل علیہ السلام له ستمائة جناح (بخاری ۲ ص ۷۲۰ مسلم ا ص ۹۷ ابو عوانہ ا ص ۱۵۳ و ترمذی ج ۲ ص ۱۶۰) عبد اللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت جبرئیل علیہ السّلام کو دیکھا کہ اُن کے چھ سو پَر تھے۔

متعدد احادیث سے اس امر کی وضاحت ہوتی ہے کہ جبرائیل علیہ السلام آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پاس کبھی حضرت دحیہ کلبیؓ اور کبھی کسی اور اعرابی اور دیہاتی کی صورت میں تشریف لایا کرتے تھے حضور نے حضرت جبرائیل کو ان کی اصلی شکل اور صورت میں صرف دو مرتبہ دیکھا تھا۔ مرة عند سدرة المنتهیٰ ومرة فی اجیاد (ترمذی ۲ ص ۱۶۰ مشکوٰۃ ۲ ص ۵۰۱، ابنِ کثیر ۴ ص ۲۵۰) ایک دفعہ (معراج کی رات) سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اور دوسری مرتبہ اَجیاد میں۔

اجیاد مکہ مکرمہ کے قریب ایک پہاڑی کا نام ہے (صراح ص ۱۲۵) اور بعثت سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اس مقام پر بکریاں چرایا کرتے تھے (ادب المفرد ص ۸۵) آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ روایت کا اصل مضمون اور مطلب کیا تھا اور برق صاحب کی تحقیق نے اُسے کیا بنا دیا ہے اگر انصاف اور دیانت سے ذرّہ بھی کام لیا ہوتا اور دماغ پر معمولی سا دباؤ ڈالا ہوتا تو ایسی فاحش غلطی کا ارتکاب ہرگز نہ کرتے اب برق صاحب ہی ازراہِ انصاف فرمائیں کہ جبرائیل علیہ السلام کو ابنِ مسعودؓ نے دیکھا تھا یا جناب رسول خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے؟ اور کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم میں بھی حضرت

جبرائیلؑ کو دیکھنے اور ان کے پروں کو گننے کی خوبی تھی یا نہیں؟ ؎

من نگویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بین و کار آساں کن

رہا برق صاحب کا یہ کہنا کہ حضرت جبرائیلؑ فرشتے تھے اور فرشتے نور ہیں اور نور وسائل پرواز سے بے نیاز ہوتا ہے تو یہ دعویٰ بھی ان کی غلط فہمی اور خود فریبی پر مبنی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:-

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (پ ۲۲ سورۃ فاطر رکوع ۱)

سب تعریف اسے اللہ تعالےٰ کے لیے جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا اور کرنے والا ہے فرشتوں کو پیغام لانے والے فرشتے پروں والے ہیں دو دو اور تین تین اور چار چار اور زیادہ کرتا ہے پیدائش میں جو چاہتا ہے بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

قرآن کریم کی یہ آیت روز روشن کی طرح اس امر کو واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے فرشتوں کو باوجود نور بنانے کے پروں سے بے نیاز نہیں کیا ہے کسی کے دو دو پر ہیں اور کسی کے تین تین اور کسی کے چار چار اور اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہے بلکہ کیا ہے جیسا کہ حضرت جبرئیلؑ کے چھ سو پر تھے رہی یہ بات کہ ان بیشمار پروں کی تخلیق کی تصویر کیسے ہوگی تو اس کا جواب قرآن کریم نے خود دے دیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اس کی قدرت سے کوئی کام بعید نہیں ہے۔ اگر بخاری وغیرہ کی روایت اس لیے محل نظر اور مخدوش ہے کہ اس میں فرشتوں کے لیے پروں کا ثبوت ملتا ہے جو برق صاحب کی تدقیق کے خلاف ہے تو وہ قرآن کریم کی اس آیت کے بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

برق صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں الغرض مُلّا ئے اسلام اعمالِ الٰہی سے یکسر غافل معجزاتِ تخلیق سے قطعاً نا آشنا فطرت کے ایمان افروز کارناموں سے بالکل بیگانہ ہے اور پھر بھی علم کا مدعی ہے (بلفظہ دو قرآن صد ۱۲) اب ملاحظہ کیجئے کہ کیا مُلّا بیچارہ ہی معجزاتِ تخلیق اور فطرت کے کارناموں سے قطعاً غافل اور نا آشنا ہے یا برق صاحب جیسے تحقیق اور تدقیق کے شہسوار بھی اس زمرہ میں آتے ہیں؟ دیکھئے وہ کیا گل افشانی فرماتے ہیں؟ ؎

تجھ کو کرنے ہیں ہزاروں دشت طے

مضطرب کیوں پہلی ہی منزل میں ہے

برق صاحب کا حدیث پر دوسرا اعتراض

تاریخی غلط بیانیاں۔ اوّل، یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ مسجد اقصیٰ (یوروشلم) کے بانی حضرت سلیمان علیہ السلام تھے تواریخ ۲ باب ۳ آیات ۱-۲ میں مذکور ہے۔ اور سلیمان خداوند کا گھر یوروشلم میں کوہ موریاہ پر جو اس کے باپ داؤد کو دکھلایا گیا تھا اور اس جگہ پر جو داؤد نے اُرنان یبوسی کے کھلیان میں مقرر کی تھی بنانے لگا اور سلیمان نے اپنی سلطنت کے چوتھے برس کے دوسرے مہینے کی دوسری تاریخ کو بنانا شروع کیا تواریخ ۲ باب ۶ آیات ۹، ۱۰ میں بیان کیا گیا ہے۔ خداوند نے میرے باپ داؤد سے کہا تھا کہ اس سبب سے کہ تو نے میرے نام کا گھر بنانے کا ارادہ کیا اچھا کیا لیکن تو خود یہ گھر نہیں بنائے گا بلکہ تیرا بیٹا جو تیری صلب سے نکلے گا وہی[1] تیرا گھر بنائے گا۔

برق صاحب نے یہ حوالجات نقل کر کے اس کے بعد تاریخی حوالوں سے یہ امر

---

[1] برق صاحب نے تاریخ ۲ باب ۶ آیات ۹-۱۰ کی عبارت نقل کرنے میں بھی متعدد غلطیاں کی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ وہی تیرا گھر بنائے گا کے بجائے اصل عبارت یوں ہے وہی میرے نام کے لیے گھر بنائے گا۔ اور باب ۳ کی آیات کے نقل کرنے میں بھی غلطیاں کی ہیں (دیکھئے کتاب مقدس ص ۴۲۶)

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے درمیان تقریباً ایک ہزار برس کا وقفہ اور عرصہ بنتا ہے اور پھر مزید تائید کے لیے علامہ قسطلانیؒ شارح بخاری (المتوفی ۹۲۳ھ) کی ایک اُدھوری اور نامکمل عبارت نقل کرکے یہ لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جو کعبہ کے بانی تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام جو بیت المقدس کے بانی تھے ان کے درمیان ایک ہزار برس سے بھی کچھ زیادہ زمانہ حائل تھا۔ پھر آگے لکھتے ہیں، لیکن بخاری کی ایک حدیث کے مطابق یہ زمانہ صرف چالیس سال بنتا ہے۔

عن ابی ذرؓ قال قلت یا رسول اللّٰہ	ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے دریافت
ایّ مسجد وضع فی الارض اوّل	کیا کہ زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد بنی فرمایا
قال المسجد الحرام قال قلت ثم	کعبہ پھر پوچھا کہ اس کے بعد کون سی مسجد
ای قال المسجد الاقصٰی قلت کم	تیار ہوئی فرمایا مسجد اقصٰی میں نے
کان بینہما قال اربعون سنۃ	پوچھا کہ ان کی تعمیر میں کتنا زمانہ حائل تھا۔
(بخاریؒ ج ۲ ص ۱۵۵)	فرمایا صرف چالیس سال۔

ہے کوئی محدث جو اس صریح تاریخی غلط بیانی کی کوئی تاویل پیش کر سکے ؟ (پھر چند سطور کے بعد لکھتے ہیں کہ) تاریخی ثبوت لائیے۔ کوئی کتاب[1] سند یا روایت پیش کیجیے الخ بلفظہٖ دو اسلام ص ۱۸۱ تا ۱۸۴ ملتقطاً و طبع ششم ص ۱۹۴ تا ص ۱۹۸

جواب۔ آپ نے برق صاحب کی تعلی، چیلنج، الٹی میٹم اور مجتہدانہ للکار تو سُن اور پڑھ ہی لی ہے اور یہ بھی آپ سمجھ چکے ہوں گے کہ بخاری شریف کی روایت ان کے نزدیک اس لیے باطل اور تاریخی غلط بیانی ہے کہ ان کے آقاؤں کی کتابوں اور ان

---

[1] یہ روایت بخاری ج ۱ ص ۴۷۷ اور مسلم ج ۱ ص ۱۹۹ میں موجود ہے ۱۲ ابوالزاہد

کے الہامی صحیفوں کے خلاف ہے اس مضمون سے حدیث کی صحت اور سقم کا معیار بھی آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان کے نزدیک کیا ہے؟ خیر ان باتوں کو آپ جانے دیجئے اور ان سے صرف نظر کرتے ہوئے کتاب، سند اور تاریخی ثبوت ملاحظہ کیجئے مشہور محدّث اور مورّخ حافظ ابوالفداء الدمشقی لکھتے ہیں۔

وعند اهل الکتاب ان یعقوب علیه السلام هو الذی اسس المسجد الاقصٰی وهو مسجد ایلیاء بیت المقدس شرفه الله وهو متجه (الی ان قال) فعلی هذا یکون بناء یعقوب وهو اسرائیل علیه السلام بعد بناء ابراهیم وابنه اسماعیل المسجد الحرام باربعین سنة (الی ان قال) وما جاء فی الحدیث من ان سلیمان بن داؤد علیهما السلام لما بنی بیت المقدس (الی ان قال) فالمراد من ذلك والله اعلم انه جدد بناءه کما تقدم من ان بینهما اربعین سنة الخ	اہل کتاب کی تحقیق یہ ہے کہ مسجد اقصٰی (جس کو مسجد ایلیاء اور بیت المقدس بھی کہتے ہیں اللہ تعالٰی اس کو مشرف کرے) کی بنیاد اور نیو حضرت یعقوب علیہ السلام نے رکھی تھی اور یہی تحقیق صحیح ہے اس لحاظ سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے (جن کا لقب اسرائیل تھا) نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے مسجد حرام تعمیر کرنے کے چالیس ۴۰ برس بعد بیت المقدس کی تعمیر کی تھی اور یہ جو حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت سلیمانؑ نے بیت المقدس کی تعمیر شروع کی الخ تو اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے اس کی تجدید کی تھی نہ کہ ابتدائی تعمیر کیوں کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اس کی تعمیر مسجد حرام کے چالیس ۴۰ برس بعد کو ہوئی تھی۔
(البدایة والنهایة ج ۱ ص ۱۶۲)	

اور اپنی مشہور و معروف تفسیر میں حافظ ابن کثیرؒ رقمطراز ہیں۔

ان يعقوب عليه السلام باني
بيت المقدس كما نطقت
بذلك الكتب المتقدمة
(الى ان قال) فزعم ابن حبانؒ
ان سليمان الذي اعتقد
انه باني بيت المقدس وانما
جدده بعد خرابه وزخرفه و
بين ابراهيم عليه السلام
اربعين سنة وهذا مما
انكر على ابن حبانؒ الخ
(تفسیر ابن کثیر ج ا ص ۱۸۵)

کہ بیت المقدس کے بانی حضرت یعقوب علیہ السلام
تھے جیسا کہ پہلی کتابوں سے یہ بات ثابت
ہو چکی ہے ابن حبانؒ نے یہ زعم کیا ہے کہ
بیت المقدس کے بانی حضرت سلیمان علیہ السلام
تھے اور ان کے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام
کے درمیان چالیس سال کا وقفہ تھا لیکن
ابن حبانؒ کی اس رائے سے کسی نے اتفاق
نہیں کیا بلکہ اس کا انکار کیا گیا ہے کیونکہ حضرت
سلیمانؑ نے تو بیت المقدس کے خراب ہونے
کے بعد اس کی تجدید اور اس پر گلکاری کا کام
کیا تھا نہ یہ کہ وہ اس کے بانی اور مؤسس تھے

اب برق صاحب ہی فرمائیں کہ کیا ان کو اس تاریخی ثبوت اور سند سے
تشفی اور تسلی ہوئی ہے یا نہیں ؟ اور لطف بر لطف یہ ہے کہ ثبوت اور سند بھی اُن
کتابوں پر منتہی ہے جو ان کے نزدیک سب سے زیادہ قابل وثوق معتبر اور معیاری ہیں
لیجئے اب ہم براہِ راست کتب متقدمہ کے حوالوں سے اس امر کو روز روشن کی
طرح واضح کرتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ بیت المقدس اور مسجد ایلیا کے بانی حضرت یعقوب
علیہ السلام تھے جو حضرت اسحاقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے (تورات
کتاب پیدائش باب ۲۸ آیت ۱۰ تا ۲۲) اور یعقوب بیر سبع سے نکل کر حاران کی
طرف چلا اور ایک جگہ پہنچ کر ساری رات وہیں رہا کیونکہ سورج ڈوب گیا تھا اور اُس نے
اُس جگہ کے پتھروں میں سے ایک اٹھا کر اپنے سرہانے دھر لیا اور اُسی جگہ سونے
کو لیٹ گیا اور خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک سیڑھی زمین پر کھڑی ہے اور اس کا

سر آسمان تک پہنچا ہوا ہے اور خدا کے فرشتے اُس پر سے چڑھتے اُترتے ہیں۔ اور خداوند اُس کے اُوپر کھڑا کہہ رہا ہے کہ میں خداوند تیرے باپ ابراہام اور اضحاق کا خدا ہوں میں یہ زمین جس پر تو لیٹا ہے تجھے اور تیری نسل کو دوں گا اور تیری نسل زمین کی گرد کے ذرّوں کی مانند ہوگی اور تو مشرق اور مغرب اور شمال اور جنوب میں پھیل جائے گا اور زمین کے سب قبیلے تیرے اور تیری نسل کے وسیلہ سے برکت پائیں گے۔ اور دیکھ میں تیرے ساتھ ہوں اور ہر جگہ جہاں کہیں تو جائے تیری حفاظت کروں گا اور تجھ کو اس ملک میں پھر لاؤں گا اور جو میں نے تجھ سے کہا ہے جب تک اُسے پورا نہ کر لوں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ یعقوب جاگ اٹھا اور کہنے لگا کہ یقیناً خداوند اس جگہ ہے اور مجھے معلوم نہ تھا۔ اور اس نے ڈر کر کہا یہ کیسی بھیانک جگہ ہے! سو یہ خدا کے گھر اور آسمان کے آستانہ کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اور یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اس پتّھر کو جسے اُس نے اپنے سرہانے دھرا تھا لے کر ستون کی طرح کھڑا کیا اور اس کے سرے پر تیل ڈالا۔ اور اُس جگہ کا نام بیت ایل رکھا لیکن پہلے اُس بستی کا نام لوز تھا۔ اور یعقوب نے منّت مانی اور کہا کہ اگر خدا میرے ساتھ رہے اور جو سفر میں کر رہا ہوں اس میں میری حفاظت کرے اور مجھے کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا دیتا رہے اور میں اپنے باپ کے گھر سلامت لوٹ آؤں تو خداوند میرا خدا ہوگا اور یہ پتھر جو میں نے ستون سا کھڑا کیا ہے خدا کا گھر ہوگا اور جو کچھ تو مجھے دے اُس کا دسواں حصہ ضرور ہی تجھے دوں گا اور پیدائش باب ۳۵ آیت ۱۴۔۱۵ میں ہے تب یعقوب نے اُس جگہ جہاں وہ اس سے ہمکلام ہوا پتھر کا ایک ستون کھڑا کیا اور اُس پر تپاون کیا اور تیل ڈالا اور یعقوب نے اُس مقام کا نام جہاں خدا اُس سے ہمکلام ہوا تھا بیت ایل رکھا۔ اور پیدائش باب ۳۵ آیت ۱۔۲۔۳ میں ہے اور خدا نے یعقوب سے کہا کہ اُٹھ بیت ایل کو جا اور وہیں رہ اور وہاں خدا کے لیے جو تجھے اس وقت

دکھائی دیا جب تو اپنے بھائی عیسو کے پاس سے بھاگا جا رہا تھا۔ ایک مذبح بنا۔ تب یعقوب نے اپنے گھرانے اور اپنے سب ساتھیوں سے کہا کہ بیگانہ دیوتاؤں کو جو تمہارے درمیان ہیں دور کر دو اور طہارت کر کے اپنے کپڑے بدل ڈالو۔ او آؤ ہم روانہ ہوں اور بیت ایل کو جائیں وہاں میں خدا کے لیے جس نے میری تنگی کے دن میری دعا قبول کی اور جس راہ میں میں چلا میرے ساتھ رہا۔ مذبح بناؤں گا اور پیدائش باب ۳۵ آیت ۶۔۷ میں ہے اور یعقوب ان سب لوگوں سمیت جو اس کے ساتھ تھے اور پہنچا بیت ایل یہی ہے اور ملک کنعان میں ہے اور اس نے وہاں مذبح بنایا اور اس مقام کا نام ایل بیت ایل رکھا کیونکہ جب وہ اپنے بھائی کے پاس سے بھاگا جا رہا تھا تو خدا وہیں اس پر ظاہر ہوا تھا۔ اور پیدائش باب ۳۳ آیت ۱۸۔۱۹۔۲۰ میں ہے اور یعقوب جب فدان ارام سے چلا تو ملک کنعان کے ایک شہر سکم کے نزدیک صحیح وسلامت پہنچا اور اس شہر کے سامنے اپنے ڈیرے لگائے۔ اور زمین کے جس قطعہ پر اس نے اپنا خیمہ کھڑا کیا تھا اسے اس نے سکم کے باپ حمور کے لڑکوں سے چاندی کے سو سکے دے کر خرید لیا۔ اور اس نے وہاں ایک مذبح بنایا اور اس نے وہاں ایک مذبح بنایا اور اس کا نام ایل الہ اسرائیل رکھا۔

قارئین کرام ان تمام اقتباسات سے یہ بات آفتاب نیم روز کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مسجد ایلیا (جس کو بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ بھی کہتے ہیں) کے بانی حضرت یعقوب علیہ السلام تھے جن کی ولادت اپنے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں ہو چکی تھی جیسا کہ قرآن کریم سے ثابت ہے اور مسجد حرام کی تعمیر کے چالیس سال بعد انہوں نے مسجد اقصیٰ کی ابتدائی تعمیر کی تھی ہم نے برق صاحب ہی کی معتبر اور مستند کتابوں سے اُن کی تسلی کر دی ہے دیکھیے وہ یہ احسان مانتے ہیں یا نہیں؟ ~

وفاؤں کے ہزاروں دے چکے ہیں امتحاں اب تک
مگر وہ ہیں کہ اس پر بھی ہیں ہم سے بدگماں اب تک

برق صاحب کا حدیث پر تیسرا اعتراض

اس اعتراض میں تاریخی غلط بیانی نمبر دوم کا ذکر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیرت کی تمام کتابیں اور حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی روایتیں اس حقیقت پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک تریسٹھ سال تھی لیکن حضور کے خادم خاص حضرت انسؓ جو خیر سے ۲۲۸۶ احادیث کے راوی بھی ہیں کہتے ہیں کہ آپ کی عمر ساٹھ سال تھی چنانچہ کہتے ہیں کہ چالیس ۴۰ برس کی عمر میں حضورؐ پر قرآن اُترنے لگا اس کے بعد آپ دس ۱۰ سال مکہ میں اور دس ۱۰ سال مدینہ میں رہے (بخاری ج ۲ ص ۱۷۶) آگے برق صاحب کے اپنے الفاظ میں سن لیجئے۔

بے شمار کتب سیرت کی شہادت اور ابن عباسؓ و عائشہؓ کی روایت کی روشنی میں حضرت انسؓ کی روایت قطعاً غلط ہے حیرت ہے کہ امام بخاریؒ نے اس غلط روایت کو اپنی صحیح میں کیوں جگہ دی؟ اور زیادہ حیرت اس امر پر ہے کہ جس انسؓ کو اپنے آقا رہبر اور پیغمبر کی عمر تک معلوم نہیں تھی اس کی باقی [1] ۸۳ روایات کو امام بخاریؒ نے کیسے صحیح سمجھ لیا ایک شخص دس برس تک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خادم خاص بن کر رہا اور اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کی عمر کتنی تھی؟ اگر معلوم نہیں تھی تو بتلائی کیوں؟ اور اگر تھی تو غلط بیانی کیوں کی؟ اگر وہ سہواً غلط بیانی کر بیٹھے تھے تو امام بخاریؒ نے اسے ایک ایسی کتاب میں

---

[1] برق صاحب کا یہ کیا ہی انوکھا اور بلند قدر معیار ہے کہ اگر بالفرض کسی سے کوئی ایک غلطی سرزد ہو جائے تو اس کی کسی بھی بات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا الا یہ کہ کوئی معصوم ہی روایت کرے ۱۲ منہ

کیوں داخل کر لیا جو قرآن کے بعد صحیح ترین کتاب سمجھی جاتی ہے (انتہی بلفظہ دو اسلام صفحہ ۱۸۵ وصفحہ ۱۸۶ طبع اوّل وصفحہ ۱۹۹ وصفحہ ۲۰۰ طبع ششم)

جواب:- ہم تو پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ برقی صاحب کو حجیت حدیث پر اگر پہاڑ جیسے وزنی دلائل اور براہین بھی نظر آتے ہیں تو اُن سے وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اس کے خلاف اگر بال کی ایک نوک بھی نظر آتی ہے تو اس پر بھی وہ اعتماد اور بھروسہ کرنے سے نہیں چوکتے بخاری اور مسلم وغیرہ میں حضرت انسؓ سے یہ روایت مروی ہے۔

عن انسؓ قال قُبِضَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو ابن ثلاث وستین سنۃ (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۲۱) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔

آپ نے دیکھا کہ کتاب اللہ کے بعد جو صحیح ترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے اُسی میں حضرت انسؓ سے (جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے خادم خاص تھے اور جو ۱۲۶۸ احادیث کے راوی ہیں) ایسی روایت موجود ہے جو حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایات اور سیرت کی تمام کتابوں کے عین مطابق ہے اب فرمایئے کہ حضرت انسؓ اور امام بخاریؒ پر برقی صاحب کا کیا اعتراض ہے؟ رہا یہ سوال کہ حضرت انسؓ کی دونوں روایتوں کا آپس میں تعارض ہے تو یہ کوئی وزنی بات نہیں ہے کیونکہ حضرت انسؓ نے جب صرف تخمینہ اور دہائیوں کا حساب بیان کیا ہے تو تین سال کی کسر حذف کر کے ساٹھ سال بیان کر دئے ہیں اور جب صحیح طور پر پوری عمر بتلانا مقصود تھی تو اُس وقت تریسٹھ سال ذکر کئے ہیں (دیکھئے نووی شرح مسلم ج ۲ ص ۲۶۰ وغیرہ) کیا آج بھی لوگ ایسا نہیں کیا کرتے کہ کبھی موٹا حساب اور دہائیوں کا اندازہ بیان کر دیتے ہیں اور کبھی صرف آنے اور پائی کا ذکر کر دیتے ہیں اور روپوں کا تذکرہ

ہی نہیں کرتے اور کبھی روایوں آتوں کے ساتھ پایوں تک کی کسر ذکر کر دیتے ہیں اس میں شرعاً، عقلاً اور عرفاً کون سی خرابی ہے جس کی وجہ سے حضرت انسؓ اور امام بخاریؒ پر اتنی ناراضگی ظاہر کی گئی ہے؟ ؎

آنکھیں اگر ہیں بند تو پھر دن بھی رات ہے
اس میں بھلا قصور کیا ہے آفتاب کا

برق صاحب کا حدیث پر چوتھا اعتراض

(تاریخی غلط بیانیوں کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ) سوم عطاءؒ بن یسارؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ سے دریافت کیا کہ کیا تورات میں حضور پرنورؐ کے متعلق کوئی آیت موجود ہے کہا کیوں نہیں؟ آپ کے متعلق یہ آیت تورات میں موجود ہے[1] یا ایها النبی انا ارسلناک شاهدا ومبشرا ونذیرا وحرزا للامیین انت عبدی ورسولی سمیتک المتوکل لیس بفظ ولا غلیظ الخ اے رسول ہم نے تمہیں شاہد بشیر نذیر اور ان پڑھ عربوں کا محافظ بنا کر بھیجا

---

[1] یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے تورات میں آپ کے مختلف اوصاف کا سوال کیا گیا ہے یہ نہیں کہ بعینہٖ یہ آیت بھی تورات میں موجود تھی۔ یہ برق صاحب نے اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے کہ تورات میں کوئی آیت موجود ہے؟ اور اس پر بنیاد رکھ کر اعتراض کی ٹھانی ہے کہ ؎

ہستی حجاب بن گئی اف رے ترے حجاب　　جب اور کوئی پردہ حائل نہیں رہا

اصل الفاظ یہ ہیں اخبرنی عن صفة رسول الله صلی الله علیه وسلم فی التوراة الخ کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفت بیان ہوئی ہے وہ بیان کرو۔ آیت کا لفظ برق صاحب کی اختراع ہے۔

ہے تُو میرا بندہ اور رسول ہے تُو نہ ترش مزاج ہے نہ تند طبع الخ

تورات کو الف سے یا تک پڑھ جاؤ یہ الفاظ کہیں نہیں ملیں گے ممکن ہے آپ یہ کہہ دیں کہ اجی صاحب! تورات میں اس قدر تحریف ہو چکی ہے کہ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں رہی یہ آیت ملے تو کہاں سے؟ اس کے دو جواب ہیں اول اگر تحریف ہو چکی تھی تو ابن عمرؓ نے وہ آیت کہاں سے دیکھ لی تھی الخ (دو اسلام ص ۱۸۶ وص ۱۸۷) اس کے بعد متعدد غیر متعلق اور دور از کار باتیں لکھ کر دوسرا جواب یوں ارشاد فرمایا ہے کہ دوم حضرت مسیح نے اعلان کیا تھا جب تک زمین و آسمان نہ ٹل جائیں ایک نقطہ یا شوشہ تورات سے ہرگز نہ ٹلے گا (انجیل متی باب ۵ آیت ۱۷) اگر تورات محرف ہو چکی تھی تو حضرت مسیح اتنے زور سے یہ اعلان کیوں کرتے صاف صاف کہہ دیتے کہ تورات گم ہو چکی ہے یا بگڑ چکی ہے اس کے تمام احکام منسوخ ہو چکے ہیں اس لیے میں نئی کتاب لے کر آیا ہوں تورات کی تصدیق کرنا اور دنیا سے ڈنکے کی چوٹ کہنا کہ تورات کا ہر شوشہ اور نقطہ اپنی جگہ پر قائم ہے صاف صاف اعلان ہے اس حقیقت کا کہ حضرت مسیح کے عہد تک تورات اپنی اصلی حالت میں باقی تھی الخ (دو اسلام ص ۱۸۹ طبع اول وطبع ششم ص ۲۰۲)

اس کے بعد برق صاحب نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تورات اور انجیل وغیرہ غیر محرّف ہیں قرآن کریم کی چند آیات اور احکام سے بھی استدلال کیا ہے جن میں بعض آیات سے استدلال تو اتنا کمزور سطحی اور باطل ہے کہ ہر مسلمان خود بخود اس کا بطلان آسانی اور ادنیٰ توجہ کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ لہٰذا ان کے نقل کرنے اور پھر ان کی تردید کرنے اور جوابات عرض کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی ہاں البتہ بعض آیات ایسی ہیں جن سے شاید کسی کو شک و شبہ پیدا ہو جائے اس لیے ہم ان کو نقل کر کے ان کا صحیح مطلب اور محمل عرض کر دیتے ہیں۔ منجملہ ان کے بعض

آیات یہ ہیں:۔

(۱) سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات میں تمام سابقہ آسمانی صحائف پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اگر وہ کتابیں محرّف ہو چکی تھیں اور غلط سلط تھیں تو ان پر ایمان لانے کا مقصد؟ (بلفظہ دو اسلام ص۱۸۹ طبع اوّل و ص۲۰۳ طبع ششم)

(۲) قرآن نے تورات اور انجیل ہر دو کی تصدیق کی ہے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ. قرآن تورات و انجیل ہر دو کی تصدیق کرتا ہے۔

تصدیق کے معنیٰ ہیں سچا سمجھنا اور درست تسلیم کرنا جب قرآن تورات و انجیل کی صداقت کا اعلان کر رہا ہے تو آپ کون ہوتے ہیں انہیں جھوٹا کہنے والے الخ (بلفظہ دو اسلام ص۱۹۰ طبع اوّل و ص۲۰۴ طبع ششم اس میں بجائے آپ کون ہوتے ہیں کے ہم کون ہوتے ہیں الخ ہے)

(۳) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَيْسُوا سَوَاءً ط مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ٥

سارے اہل کتاب بُرے نہیں ان میں ایسے نیک اور پرہیزگار بھی موجود ہیں جو رات کو اللہ تعالیٰ کی آیات (تورات و انجیل) پڑھتے اور سجدے کرتے ہیں اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں نیکی کی ترغیب دیتے اور برائی سے روکتے اور نیک اعمال کی طرف بے تابانہ بڑھتے ہیں یہ لوگ صالح ہیں۔

اِس آیت میں تورات و انجیل کو اللہ تعالیٰ کی آیات کہا گیا ہے اگر تورات

بگڑ چکی ہوتی تو اللہ اُسکے احکام کو آیات کیوں کہتا؟ اور اس پر عمل کرنے والوں کو صالحین میں کیوں شمار کرتا؟ (بلفظہٖ دو اسلام ص۱۹۲ طبع اوّل و ص۲۰۶ و ص۲۰۷ طبع ششم)

یہ سب کچھ لکھ چکنے کے بعد آخر میں برق صاحب فیصلہ صادر فرماتے ہوئے تمام ماسبق بحث کا نتیجہ یوں لکھتے ہیں کہ ان تفاصیل کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پہ پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلّم میں تورات اصلی حالت میں موجود تھی اور وہی تورات ہم تک پہنچی ہے۔ اس تورات میں ابن عمرؓ کی ذکر کردہ آیت کہیں موجود نہیں اس لیے یہ حدیث ایک تاریخی غلط بیانی اور جعلی ہے (انتہی بلفظہٖ دو اسلام ص۱۹۴ و ص۱۹۵ طبع اول و ص۲۰۸ طبع ششم)

جواب: اس سے قبل کہ ہم مرکزی مقدمات اور سوالات کے جوابات عرض کریں چند ضمنی اور ضروری امور کی طرف اشارات کیے دیتے ہیں۔

① برق صاحب نے یہ تمام مقدمات صرف اس لیے پیش کیے اور متعدد صفحات محض اس وجہ سے سیاہ کئے ہیں کہ ابن عمرؓ کی روایت کو جعلی من گھڑت اور باطل ثابت کیا جائے۔ اور اس کی وجہ سے بخاری شریف سے اعتماد جاتا رہے اگر یہ مقصد ان کے پیش نظر نہ ہوتا تو بلاوجہ اتنی کاوش کی ان کو ہرگز ضرورت نہ تھی۔

② اس تمام بحث سے برق صاحب کے ایمانی اور نفسیاتی جذبات کا علم بھی بخوبی ہو جاتا ہے کہ ان کو حدیث سے کتنی عداوت اور نفرت ہے اور اہل کتاب سے کیسی عقیدت اور محبت ہے کہ جو روایت ان کی کتابوں کے معیار پہ نہیں وہ جعلی اور باطل ہے سچ کہا گیا ہے۔ ؎

کبوتر با کبوتر باز با باز

③ یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نہیں جیسا کہ برق صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے بلکہ یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمروؓ (واو کے ساتھ) بن العاص سے ہے

(دیکھئے بخاری ج ۱ ص ۲۸۵ اور مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۱۲ وغیرہا) ان کے علاوہ یہ روایت حضرت عبداللہؓ بن سلام سے بھی مروی ہے (دیکھئے مسند دارمی ص ۴۷ وابن کثیر ج ۲ ص ۴۹۶ و مشکوٰۃ ص ۵۱۲ وغیرہا) اب آپ ان کے پہلے مقدمے کا ذکر اگر تحریف ہو چکی تھی تو ابن عمرؓ نے وہ آیت کہاں سے دیکھ لی تھی، جواب سنیئے:-

ا۔ بلاشک تورات میں تحریف واقع ہو چکی تھی اور قرآن کریم بھی اس پر شاہد ہے يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ پ ۱ ـ سورہ بقرہ رکوع ۵) کہ وہ (یہودی) اپنے ہاتھوں سے (محرّف) کتاب (تورات) لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ (پ ۶ ـ سورہ المائدہ رکوع ۳) کہ وہ اللہ تعالیٰ کی باتوں میں تحریف کر کے ان کی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔

چونکہ محمد علی صاحبؒ لاہوری (مرزائی) بھی کتب مقدسہ کی ہمہ وجوہ صحت کے قائل ہیں اور برق صاحب بھی اس پر بضد ہیں اور جب سے امریکہ کی نازنینوں کی چوسی ہوئی گندم کا عطیہ ہم کو ملا ہے اس کے بعد پادری صاحبان بھی دن رات تبلیغ اور بائبل کی تعلیم کی ترویج میں منہمک ہیں اس لیے ہم اس پر قدرے تفصیلی گفتگو کرتے ہیں تاکہ نوجوان طبقہ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو یہ حقیقت ہے کہ خود محقق پادری صاحبان کو اس بات اقرار ہے کہ بائبل میں تحریف واقع ہوئی ہے چنانچہ پادری کمنی کاٹ

---

[۱] چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ کسی سچے مسلمان کو کتب مقدسہ کے محرف اور غیر معتبر ہونے کا اشتباہ کرنے کی گنجائش نہیں رہتی اب کتب مقدسہ کی صحت میں کلام کرنا قرآن شریف کی صحت میں کلام کرنے کے مساوی ہوگیا ہے (منقول از اخبار "پیغام صلح" لاہور ۱۸ نومبر ۱۹۲۵ء)

صاحب بشپ والٹن صاحب اسٹالمن صاحب، کاکرن صاحب عماد الدین صاحب شیلر صاحب، اسٹرن صاحب، ادریس ہارن صاحب، موشیم صاحب، اوڈن صاحب، کیلسو صاحب، لوتھر صاحب، ڈاکٹر بیلی صاحب، فانڈر صاحب اور برکس صاحب وغیرہ کو اسکا اقرار ہے[1] اور پادری والٹس صاحب فرماتے ہیں کہ اسقوف بٹلر صاحب نے کہا کہ انگلستان میں ایک بھی فاضل ایسا نہیں ہے جو پاک نوشتوں کے الہام کا قائل ہو (قربت الٰہی ص۵۹ بحوالہ نوید جاوید ص۱۷) اور امریکی مشن کے پراٹسٹنٹ پادری صاحبان کا توریت وانجیل کے الہام کی بابت جو عقیدہ ہے اور جسے انہوں نے چھپوا کر تمام ہندوستان میں مشتہر کیا، جس میں خصوصیت سے ذیل کے پادری صاحبان کے نام درج ہیں۔

پادری ای راس، مس آر ساٹمس، اگرو شش، لیکلرک، پفایف، بشپ لوتھ، بشپ واربرٹن، آر جڈیکن، پیلی کلارک، ڈاڈرج، ابیکسٹر، آرج بشپ سمیز اور طامس اسکاٹ وغیرہ) اس میں یہ مقولہ بھی ہے کہ بائبل میں خدا کا کلام ہے لیکن بائبل ساری خدا کا کلام نہیں (نور افشاں لدھیانہ مطبوعہ ۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء امریکن مشن پریس باہتمام پادری کیلسو صاحب نمبر ۳۰ جلد ۶ صفحہ ۲۳۸ بحوالہ نوید جاوید ص۱۸۵) اور خاص طور پر بشپ کولنز و صاحب کہ انگلستان کے فضلا اکابر میں ہیں انہوں نے اپنی رائے توریت کی نسبت یہ ظاہر کی ہے کہ یہ کتاب حضرت موسیٰؑ کی لکھی ہوئی نہیں اور الہامی کتاب نہیں بلکہ ایک تواریخ معتبر ہے (بحوالہ نوید جاوید ص۸۲) افسوس کا مقام ہے کہ بائبل کے محافظ تو اس کے متعلق یہ رائے اور نظریہ رکھتے ہیں اور برق صاحب

---

[1] نوید جاوید میں ان کی عبارتیں بھی نقل کردی گئی ہیں اور ہم نے اپنی کتاب عیسائیت کا پس منظر میں اس پر باحوالہ مبسوط بحث کردی ہے۔

ان کی طرف سے بے جا وکالت کرکے یہ لکھتے ہیں کہ میرا یہ ایمان ہے (تفصیل آگے آئے گی) کہ بائبل میں کوئی تحریف واقع نہیں ہوئی (بلفظہٖ ایک اسلام ص۹۱) اور اس کا مصداق بننا چاہتے ہیں کہ مدعی سست اور گواہ چست علاوہ بریں برق صاحب کو خود سو سال کے اندر مختلف اوقات میں طبع شدہ بائبل کے نسخوں کا آپس میں موازنہ اور تقابل کرکے اندازہ کر لینا چاہیئے کہ کیا آج سے تقریباً اسی سال پہلے کی لکھی ہوئی بائبل اور آج کی لکھی ہوئی بائبل میں کوئی فرق اور تحریف ہوئی ہے یا نہیں؟ شاید کہ بالآخر ان کو بھی عیاں راچہ بیاں کہنا ہی پڑے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم برق صاحب کی تسلی کے لیے انہیں کے ہم مسلک و ہم مشرب مسٹر غلام احمد صاحب پرویز کے حوالہ سے بائبل اور اناجیل کے متعلق چند اقتباسات نقل کریں تاکہ اگر مکی اور مدنی سرمہ ان کے لیے اکسیر ثابت نہ ہو تو پرویزی سرمہ ہی شاید مفید ہو جائے۔ پرویز صاحب (جن پر پاکستان کے ہر مکتب فکر کے ایک ہزار علماء نے متفقہ طور پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے) لکھتے ہیں۔

اناجیل اور ان کی تحریف

سپنگلر لکھتا ہے:۔ جب حضرت مسیح کے دوست اور شاگرد بوڑھے ہوگئے اور یروشلم میں اس جماعت کا صدر آپ کا بھائی تھا تو انہوں نے ان قصص و روایات کو جو عام طور پر زبان زد خلائق تھیں یکجا مرتب کرکے آپ کی سوانح عمری تصنیف کی یہی انجیل ہے (زوال مغرب جلد دوم ص۲۱۴ بحوالہ معارف القرآن جلد ۴ ص۲۹)

موسیو رینان لکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ڈیڑھ سو سال میں اناجیل کو کوئی مستند حیثیت حاصل نہ تھی ان میں اضافے کرنے یا مختلف انداز سے ترتیب دینے یا ایک کی تکمیل دوسرے سے کرنے میں کوئی باک اور تامل نہ تھا۔ (حیات مسیح ص۱۲ بحوالہ معارف ۴ ص۳۱) یوحنا کی انجیل کے متعلق یہ مؤرخ رقمطراز ہے:۔

ہیں کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ چوتھی انجیل تمام کی تمام گلیلی کے ماہی گیر کے قلم کی لکھی ہوئی ہے.... حقیقت یہ ہے کہ اس میں اکثر اضافے بعد کے ہیں (ص ۱۴ و ص ۱۶ بحوالہ معارف ۴ ص ۳۲ سینٹ پال کا سابقہ ڈین ڈاکٹر (W.R. Inge) (ڈبلیو، آر، انجے) اپنی کتاب The Fall Of The idealas (دی فال آف دا آئیڈلز) میں لکھتا ہے کہ بہت کم علماء ایسے ہوں گے جو اس باب میں اختلاف کرتے ہوں کہ انجیل چہارم (یوحنا) ایشیائے کوچک کے کسی گمنام تصوف پسند نے ۹۵ء اور ۱۲۵ء کے درمیان لکھی تھی (ص ۲۶۱ معارف ۴ ص ۳۲) متی اور یوحنا کے بیانات کا ذکر کرنے کے بعد موسیو رینان لکھتا ہے کہ اگر مسیح نے ویسے ہی باتیں کی تھیں، جیسے متی نے لکھا ہے تو یقیناً وہ (مسیح) یوحنا کے بیان کے مطابق باتیں نہیں کر سکتا تھا (یعنی متی اور یوحنا کے اسلوب و انداز میں اس قدر بیّن فرق ہے کہ ایک ہی شخص ایسے متضاد انداز میں باتیں کبھی نہیں کر سکتا ص ۱۶ لوقا کی انجیل کے متعلق رینان کا بیان ہے کہ :- اس انجیل کی تاریخی حیثیت بہت کمزور ہے یہ صحیفہ ہم تک دوسرے ہاتھوں سے پہنچا ہے اس میں کئی فقرے موڑے توڑے ہوئے اور مبالغہ آمیز ہیں اسے تو (یروشلم کے) ہیکل کے متعلق بھی صحیح اندازہ نہیں (ص ۳۲۲ معارف ۴ ص ۳۲) ہر چہار انجیل کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ اناجیل کھلے طور پر ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں (ص ۲۹ معارف ۴ ص ۳۲) اسی طرح ڈاکٹر Joad (جوڈ) اپنی کتاب God and Evil (گوڈ اینڈ ایول) میں لکھتا ہے کہ اناجیل کے باہمی تضاد نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ (ص ۳۱ معارف ۴ ص ۳۲)

ان اختلافات یا اغلاط کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ دورِ حاضر کی پیداوار ہیں؟ یہ تو اناجیل کی تالیف کے ساتھ ہی شروع ہو گئے تھے مشہور فلاسفر Celsus (سیلسوس) قریب ۱۸۰ء میں لکھتا ہے کہ عیسائیوں نے اپنی مقدس کتابوں میں

دیدہ دانستہ، قریب کا لفظ ادارے سے زرد بدل کر ڈالا ہے (بحوالہ معارف القرآن جلد چہارم صلا۳ بہ تاریخ) ڈاکٹر جوزڈ اناجیل کے باہمی اختلافات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے لیکن جو چیز اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے وہ حضرت عیسٰی کا وہ کیرکٹر ہے جو اناجیل پیش کرتی ہیں and Israel دیکھو گوڈاینڈ ایول معارف القرآن ۴ صف ۴۵)

ریلیجس ٹریکٹ سوسائٹی (لندن) نے ایک رونداد میں یہ مضمون شائع کیا ہے کہ ۱۵۹۰ء میں پوپ کی نگرانی میں علما کی ایک مجلس نے ایک نسخہ مرتب کیا پوپ نے اس کو کتابت سے قبل دوران طباعت اور چھپنے کے بعد حرف بحرف پڑھا اس کی تصحیح کی اس کے بعد اسے مستند قرار دے کر شائع کیا گیا لیکن ابھی یہ نسخہ شائع ہوا ہی تھا کہ معلوم ہوا کہ اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں چنانچہ اسے پھر واپس لے لیا گیا اور ۱۵۹۲ء میں اس سے زیادہ صحیح ایک اور نسخہ شائع کیا گیا ان دونوں نسخوں میں نمایاں اختلاف ہے اس کے بعد ۱۵۹۳ء میں ایک اور نسخہ شائع ہوا جو ۱۵۹۲ء والے نسخے سے بھی مختلف تھا ڈاکٹر جیمس نے ان دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا تو ان میں قریب دو ہزار اختلافات نظر پڑے جن میں بعض آیات پوری کی پوری ایک دوسرے سے مختلف تھیں اور بہت سی آیات ایک دوسرے سے متضاد تھیں بایں ہمہ ان دونوں نسخوں کو یکساں طور پر مستند تصور کیا گیا صف ۲۳،۲۴)

غور کیجئے کہ اناجیل کے مستند نسخے کس طرح وجود میں آتے رہے ہیں یہی مستند نسخے تھے جن کا انگریزی ترجمہ شاہ جیمس کے عہد میں ۱۶۱۱ء میں ہوا اور پھر ۱۸۸۱ء میں ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع کیا گیا سوچئے کہ اس آخری نسخہ کو (جو پھر ہر نئے ایڈیشن کے وقت بدلا جاتا ہے) حضرت مسیح علیہ السلام کی اصلی اور غیر محرف انجیل سے کیا نسبت باقی رہ جاتی ہے انگلیکن کا چرچ کا بشپ (چارلس گور Gore) لکھتا

ہے سینٹ کرو سٹم کی طرح میرے لیے بھی اس امر کا تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ اناجیل غلطی سے مبرا ہیں (The Holy Spirit and the church معارف ۴ ص ۲۸)
بلکہ برق صاحب کو خود بھی اس کا اقرار ہے کہ بعض گذشتہ انبیا کے الہامی صحائف میں ان کی احادیث بھی شامل ہوگئی تھیں اور کتاب الہٰی کا حلیہ بگڑ گیا تھا (بلفظہ دو اسلام ص ۳۹ طبع اول و طبع ششم ص ۵۵) برق صاحب تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ
ں زمانے میں الہامات کو محفوظ رکھنے کا طریقہ یہ تھا کہ کسی پیغمبر کے تمام اقوال و
ال ایک کتاب میں جمع کر دیے جاتے تھے اور یہ کتاب ایک قسم کی سوانح عمری بن جاتی تھی جس میں اس نبی کے تمام حالات ولادت سے وفات تک لکھ دیے جاتے تھے لکھنے والا عموماً کوئی اُمتی ہوا کرتا تھا ہر چند یہ کہ یہ لکھنے والے اپنے انبیاء کے عشق میں سرشار اور سچی عقیدت میں چوٹی تک ڈوبے ہوئے تھے اور تمام واقعات کو پوری تحقیق کے بعد سپرد قلم کیا کرتے تھے لیکن آخر انسان تھے اس لیے بالکل ممکن ہے کہ ان سے کوئی لغزش ہوگئی ہو کوئی واقعہ غلط لکھ گئے ہوں یا کوئی بات خلاف حقیقت کہہ دی ہو (انتہی بلفظہ ایک اسلام ص ۸۳) اور پھر آگے لکھتے ہیں کہ :۔
اُس زمانے میں دستور ہی یہی تھا کہ انبیاء کے اقوال و اعمال کو یکجا جمع کر دیا جاتا تھا۔ اقوال الہامی ہوا کرتے تھے اور اعمال کی تفسیر انسانی اس لیے انسانی و الہامی اقوال کی آمیزش کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا (بلفظہ ایک اسلام ص ۸۳) اور پھر آگے لکھتے ہیں کہ دنیا میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جس میں انسانی کلام موجود نہیں اس لیے ہم مسلمانوں کا تصوّر ہی الہامی صحائف کے متعلق یہ قائم ہو گیا ہے کہ وہ انسانی کلام سے کلیتہً پاک ہوں اور جب ہم صحائف گذشتہ کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ہمیں حیرت بھی ہوتی ہے اور کچھ بدگمانی سی بھی کہ جامعین صحائف نے ان میں اپنا کلام کیوں شامل کر دیا الخ بلفظہ ایک اسلام ص ۸۴) ان صحائف میں

اگر لغزش، غلط واقعہ خلاف حقیقت بات اور انسانی اقوال کی آمیزش کے باوجود بھی وہ غیر محرف ہیں اور اگر ان الہامی صحائف میں انسانی کلام کے موجود ہونے کے باوجود بھی ان میں تحریف واقع نہیں ہوئی تو نہ معلوم برق صاحب کی اصطلاح میں تحریف کس بلا کا نام ہے؟ اسی چیز کا نام تو تحریف ہے اور کتب مقدسہ اور صحائف اولیٰ میں ایسی تحریف باقرار برق صاحب واقع ہوئی ہے جس سے کوئی مفر نہیں ہے اور مزید برق صاحب کے الہامی صحائف میں تحریف کے بعض حوالے عنقریب ذکر ہوں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔ لوگوں میں تو یہ مقولہ مشہور چلا ہی آتا تھا کہ دروغ گورا حافظہ نباشد لیکن برق صاحب خود بھی لکھتے ہیں کہ آدمی کو اپنی کہی ہوئی بات تک یاد نہیں رہتی۔ (دو اسلام ص ۲۹ طبع اول وص ۵۵ طبع ششم) ع

مانتے جس کو نہ تھے لیجئے پہنچے وہاں!

۲۔ اگرچہ دلائل بالا کی رو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تورات میں تحریف واقع ہو چکی ہے لیکن اس کا کون مدعی ہے کہ تورات کی ہر ایک آیت میں تحریف کر دی گئی ہے فی الجملہ تحریف اور چیز ہے جس کا کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا اور ساری تورات اور بائیبل کی تحریف جدا بات ہے اور ان دونوں باتوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے اس تفصیل سے بخوبی معلوم ہو گیا کہ فی الجملہ تحریف سے ساری تورات کی تحریف لازم نہیں آتی جیسا کہ برق صاحب نے خوش فہمی کا ثبوت دیا ہے کہ اگر تورات محرف ہو چکی تھی تو صاف صاف کہہ دیتے کہ تورات گم ہو گئی ہے یا بگڑ چکی ہے اس کے تمام احکام منسوخ ہو چکے ہیں الخ کہاں فی الجملہ تحریف اور کہاں تورات کا گم ہو جانا اور اس کے تمام احکام کا منسوخ ہو جانا؟ یہ برق صاحب ہی کا کمال ہے کہ فی الجملہ اور بالجملہ کا فرق نہیں

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

۳۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں یہود کو تورات پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ملامت کیا گیا ہے جن میں سے ایک یہ ہے قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (پ۴ آل عمران رکوع ۱)

کہہ دیجئے کہ لاؤ تورات سو پڑھو اس کو اگر ہو تم سچے اس سے معلوم ہوا کہ تورات کا کچھ حصہ ضرور صحیح اور اپنی اصلی حالت میں موجود تھا جس کو بطور حجیت یہود کے سامنے پیش کیا گیا ہے اور چونکہ قرآن کریم کے نزول کے بعد سابق کتابوں کی چنداں ضرورت نہ تھی اور نہ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید کی طرح ان کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے لہذا اُن میں تحریف کا واقع ہونا ایک فطرتی امر ہے جس کا کسی طرح انکار اور رد نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ اس میں کیا تعجب اور حیرت ہے کہ شاید (بلکہ یقیناً) جن صفات کا حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ نے حوالہ دیا ہے اُس وقت تورات میں موجود ہوں اور بعد کو وہ بھی تعصب اور عناد کی وجہ سے پادری صاحبان کے ہاتھوں کتب سے دریا برد ہو گئی ہوں؟ ان کے دوسرے مقدمے کا ذکر جب تک زمین و آسمان نہ ٹل جائیں ایک نقطہ یا شوشہ تورات سے ہرگز نہ ٹلے گا، جواب ملاحظہ ہو۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہود سے خطاب فرمایا تھا کہ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ۔ الآیۃ (پ ۳۔ سورہ آل عمران۔ رکوع ۱۳) بعض چیزیں تمہارے اوپر حرام کر دی گئی تھیں میں ان کو (باذن خداوندی) تمہارے لیے حلال کر دوں۔

اِس حکم سے صاف طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تورات میں جن اشیاء کو یہود پر حرام کر دیا گیا تھا حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کی حلت کا اعلان کیا تھا۔ اب برق صاحب ہی فرمائیں کہ کیا حرام کرنے سے نقطہ یا

شوشہ ٹل سکتا ہے یا نہیں؟ یا ممکن ہے کہ ان کی تحقیق میں نقطہ اور شوشہ کوئی اتنی بڑی چیز ہو جس کے بیچ جنت و قدامت کے احکام نہ آسکتے ہوں اور شاید کہ اُس وقت زمین اور آسمان بھی ٹل گئے ہوں خدا تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید ہے خصوصاً جب کہ وَاِنْ کَانَ مَکْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ بھی موجود ہے جس میں مخالفین اسلام کی بڑی بڑی مکاریوں کا ذکر ہے جن کے ایک رکن برق صاحب بھی ہیں۔

۲۔ ایمان گوارا اور دل برداشت نہیں کرتا کہ اپنے قلم سے برق صاحب کی اُس تورات کے چند اقتباسات نقل کروں جو ان کے نزدیک بالکل صحیح ہے اور جس میں حضرات انبیاء عظام علیہم السلام کی ایسی توہین کی گئی ہے کہ بدن پہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور دل کانپ رہا ہے مگر بامر مجبوری نقل کفر کفر نباشد پر عمل کرتے ہوئے صرف چند حوالے نقل کرتا ہوں برق صاحب کان کھول کر سنیں

ا۔ کیا اصلی تورات میں کوئی ایسی آیت نازل ہوئی تھی جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت نوح علیہ السلام نے شراب پی تھی اور نشہ کی حالت میں بالکل برہنہ ہو گئے تھے؟ (معاذ اللہ) تورات کتاب پیدائش باب ۹ آیت ۲۰۔۲۱ میں مذکور ہے کہ اور نوح کاشتکاری کرنے لگا اور اس نے ایک انگور کا باغ لگایا اور اس نے اس کی مے (شراب) پی اور اُسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرے میں برہنہ ہو گیا

۲۔ کیا خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ تورات میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام کو شراب پلائی گئی تھی اور انہوں نے اپنی صلبی دو لڑکیوں سے زنا کیا اور وہ دونوں حاملہ ہو گئی تھیں؟ (العیاذ باللہ) تورات کتاب پیدائش باب ۱۹ آیات ۳۰ تا ۳۸ میں لکھا ہے۔ اور لُوطؔ ضُغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں کیونکہ اُسے ضغر میں بستے ڈر لگا اور وہ اور

اُس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بڈھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے آؤ ہم اپنے باپ کو مے (شراب) پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں تاکہ اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو انہوں نے اسی رات اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی اور دوسرے روز یوں ہوا کہ پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ دیکھ کل رات کو میں اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی آؤ آج رات بھی اس کو مے پلائیں اور تو بھی جا کر اُس سے ہم آغوش ہو تاکہ ہم اپنے باپ سے نسل باقی رکھیں۔ سو اُس رات بھی انہوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور چھوٹی گئی اور اس سے ہم آغوش ہوئی پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اُٹھ گئی۔ سو لوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔ اور بڑی کے ایک بیٹا ہوا اور اُس نے اس کا نام موآب رکھا اور وہی موآبیوں کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں۔ اور چھوٹی کے بھی ایک بیٹا ہوا اور اُس نے اُس کا نام بن عمی رکھا وہی بنی عمون کا باپ ہے جو اب تک موجود ہیں۔

۳۔ کیا جو تورات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری گئی تھی اُس میں یہ واقعہ درج تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے زور آزمائی اور کشتی کی اور زور آزمائی میں یعقوب علیہ السلام غالب رہے (نعوذ باللہ) تورات کتاب پیدائش باب ۳۲ آیات ۲۴ تا ۳۰ میں بیان کیا گیا ہے کہ:۔

اور یعقوب اکیلا رہ گیا اور پو پھٹنے کے وقت تک ایک شخص وہاں اس سے کشتی لڑتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اس پر غالب نہیں ہوتا تو اس کی ران کو اندر کی طرف سے چھوا اور یعقوب کی ران کی نس اُس کے ساتھ کشتی کرنے میں

چڑھ گئی۔ اور اُس نے کہا مجھے جانے دے کیونکہ پو پھٹ چلی یعقوب نے کہا کہ جب تک تو مجھے برکت نہ دے میں تجھے جانے نہیں دوں گا۔ تب اُس نے اُس سے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے؟ اُس نے جواب دیا یعقوب۔ اُس نے کہا تیرا نام آگے کو یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا تب یعقوب نے اس سے کہا کہ میں تیری منت کرتا ہوں تو مجھے اپنا نام بتادے اُس نے کہا کہ تو میرا نام کیوں پوچھتا ہے؟ اور اُس نے اسے برکت دی اور یعقوب نے اس جگہ کا نام فنی ایل رکھا اور کہا کہ میں نے خدا کو رو برو دیکھا تو بھی میری جان بچی رہی۔

۴۔ کیا اصلی اور صحیح تورات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد جب کہ وہ دفن ہو چکے تھے نازل ہوئی تھی؟ یا ان کی زندگی میں ان پر اتاری گئی تھی؟ موجودہ تورات کتاب استثنا، باب ۳۴ آیت ۵۔ ۶ کا فیصلہ تو یہ ہے کہ پس خداوند کے بندہ موسیٰ نے خداوند کے کہے کے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی۔ اور اُس نے اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغفور کے مقابل دفن کیا پر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں۔

قارئین کرام یہ ہے برق صاحب کی وہ اصلی اور غیر محرّف تورات جس کا ایک ایک نقطہ اور شوشہ منزل من اللہ ہے اور جس کی وجہ سے متعدد احادیث اور خصوصاً حضرت ابن عمرؓ کی حدیث باطل اور جعلی ہے تعجب اور حیرت ہے اس تحقیق پر۔ اب آپ سابقہ آسمانی صحائف میں سے جن کو برق صاحب اصلی حالت میں غیر محرف تسلیم کرتے ہیں صرف دو واقعے اور سُن لیجئے۔

۱۔ کیا کسی آسمانی کتاب اور صحیفہ میں یہ مضمون اتارا گیا تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک اجنبی خوب صورت عورت سے مجامعت کی اور وہ حاملہ

ہوگئی تھی؟ عیاذاً باللہ۔

سموئیل ۲ باب ۱۱ آیت ۲ تا ۵ میں بیان کیا گیا ہے کہ

اور شام کے وقت داؤد اپنے پلنگ پر سے اٹھ کر بادشاہی محل کی چھت پر ٹہلنے لگا اور چھت پر سے اُس نے ایک عورت کو دیکھا جو نہا رہی تھی اور وہ عورت نہایت خوب صورت تھی۔ تب داؤد نے لوگ بھیج کر اُس عورت کا حال دریافت کیا اور کسی نے کہا کیا وہ الیعام کی بیٹی بت سبع نہیں جو حتی اوریا کی بیوی ہے؟ اور داؤد نے لوگ بھیج کر اُسے بلا لیا وہ اُس کے پاس آئی اور اس سے صحبت کی (کیونکہ وہ اپنی ناپاکی سے پاک ہو چکی تھی) پھر وہ اپنے گھر کو چلی گئی۔ اور وہ عورت حاملہ ہوگئی سو اس نے داؤد کے پاس خبر بھیجی کہ میں حاملہ ہوں

۲۔ کیا اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی آسمانی صحیفہ میں یہ قصہ اتارا گیا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خدا کی پیروی کے بجائے اُس کی نافرمانی کی تھی؟ اور کسی بدی کا ارتکاب کیا تھا؟ اور اپنی بیویوں کے کہے پر بت پرستی کی تھی؟ (معاذ اللہ) سلاطین ۱۔ باب ۱۱ آیت ۴-۵-۶ میں مذکور ہے کیونکہ جب سلیمان بڈھا ہوگیا تو اُس کی بیویوں نے اُس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر لیا اور اس کا دل خداوند اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ رہا جیسا اُس کے باپ داؤد کا دل تھا۔ کیونکہ سلیمان صیدانیوں کی دیوی عستارات اور عمونیوں کے نفرتی ملکوم کی پیروی کرنے لگا۔ اور سلیمان نے خداوند کے آگے بدی کی اور اُس نے خداوند کی پوری پیروی نہ کی جیسی اُس کے باپ داؤد نے کی تھی۔

حضرات انبیاء عظام علیہم السلام کی طرف ایسے ناپاک اور قبیح افعال کی نسبت کرنا بجائے خود جرم عظیم ہے چہ جائیکہ اس پر اصرار علماء کرام کی طرف سے جب برق صاحب کو یادداشت کے طور پر اس کی طرف توجہ دلائی گئی تو بجائے اس کے کہ اس غلط اور باطل نظریہ سے توبہ کرکے وہ مسلمانوں کی صف میں شریک ہو جاتے انہوں نے ایسی

رکیک اور بیہودہ تاویلات سے کام لیا جو عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ دوسرا اعتراض بڑا شدید اور سنگین ہے جس کا جواب عیسوی محققین نے بالعموم یہی دیا ہے کہ انبیاء سے بھی گناہ سرزد ہو سکتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ ہماری کتب عقائد میں درج ہے کہ انبیا معصوم ہوتے ہیں لیکن قرآن کریم اس کی تائید نہیں کرتا حضرت آدم علیہ السلام کی نافرمانی ابن آدم ہونے کی وجہ سے چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن اللہ کے ہاں آدم و ابلیس ہر دو نافرمانی کے برابر مجرم تھے دونوں کو سزا بھی ایک جیسی دی ابلیس کو آسمان سے نکال دیا اور آدم کو جنت سے دونوں کی نافرمانی کو عصیان و غوایت سے تعبیر کیا پھر عصیان و تکبر اور غوایت کی وہ آیتیں جو حضرت آدم اور ابلیس کے متعلق نازل ہوئی ہیں نقل کرکے لکھتے ہیں کہ آدم و ابلیس ہر دو نے نافرمانی کی اور دونوں گمراہ ہوئے فرق صرف یہ تھا کہ ابلیس اکڑا رہا اور آدم نے رو رو کر معافی مانگ لی الخ بلفظہ ایک اسلام ص۸۴ و ص۸۵) یہ عبارت بغور پڑھیے جو اس بات پر نص صریح ہے کہ برق صاحب کے نزدیک انبیاء عظام معصوم نہیں ہوتے اور گویا حضرت نوح، حضرت لوط اور حضرت داؤد علیہم السلام کی طرف، ان ناشائستہ حرکات کی نسبت بالکل صحیح ہے (معاذ باللہ) اور حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس لعین دونوں گمراہ نافرمان اور برابر کے مجرم تھے۔ (العیاذ باللہ) کاش کہ اسی پر برق صاحب نے بس کی ہوتی مگر ہائے افسوس کہ وہ تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ اگر شیطان آدم و موسیٰ سے عصیان و قتل جیسے جرائم کرا سکتا تھا تو حضرت داؤد کو بھی گناہ کی ترغیب دے سکتا تھا اگر آدم و موسیٰ کے گناہ معاف ہو سکتے تھے تو حضرت داؤد کو بھی عفو و مغفرت سے نوازا جا سکتا تھا اللہ کا باغی وہ نہیں جس سے زندگی بھر میں ایک آدھ گناہ سرزد ہو جائے بلکہ وہ ہے جو گناہ کے بعد شیطان کی طرح اکڑ جائے گناہ کے بعد احساس گناہ اور ندامت کی پاکیزہ کیفیت صرف اللہ کے خاص بندوں

ہی میں پیدا ہوسکتی ہے۔ اور اللہ نے اس کیفیت کی گہرائی دیکھنے کے لیے بارہا اپنے بندوں کو ابتلاء میں ڈالا اور حضرت داؤد کی ابتلائیں اسی قسم کی تھی (ملاحظہ ایک اسلام ص ۹۶) یہ عبارت اس پر شاہد عدل ہے کہ برق صاحب کے نزدیک حضرت داؤد علیہ السلام سے یہ گناہ عظیم صادر ہوا تھا (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) یہ ساری خرافات تسلیم کر لینے کے بعد بھی بائیبل غیر محرف اور صحیح ہے مگر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث معمولی سے شبہ کی بنا پر بھی جعلی اور من گھڑت ہیں سبحان اللہ۔

حضرات! شرک، بت پرستی، شراب نوشی اور زنا وغیرہ وہ کون سا بدترین گناہ اور جرم ہے جو برق صاحب کی اصلی تورات اور آسمانی صحائف میں انبیاء عظام علیہم السلام کی بلند رتبہ ہستیوں کی طرف منسوب نہ کیا گیا ہو؟ اب برق صاحب ہی از راہِ انصاف فرمائیں کہ کیا سورۃ بقرہ کی آیات میں اسی تورات اور انہیں آسمانی صحائف پر ایمان لانے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے جن میں پیغمبروں کی بلند و رفیع ہستیوں کی طرف یہ شرمناک اور قبیح ترین حرکات منسوب کی گئی ہیں؟ اور کیا قرآن کریم اسی تورات اور انہیں آسمانی صحائف کا مصدق ہے جن کا نمونہ آپ نے ملاحظ فرمالیا ہے؟ اور کیا قرآن کریم اُس انجیل کا مصدق ہے جن میں اسمہٗ احمد کی بشارت کا صراحت سے کہیں نام و نشان تک نہیں ملتا اور جس میں جگہ جگہ خدا تعالےٰ کو باپ اور حضرت مسیح کو عالم الغیب، حاضر و ناظر، نور اور مختارِ کل وغیرہ ثابت کیا گیا ہے؟ برق صاحب کو ذرہ ہوش میں آکر تعصب اور غفلت کی پٹی آنکھوں سے اتار کر غور کرنا چاہیئے کہ وہ کیا فرما رہے ہیں؟ اس میں کسی طرح شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اجمالی طور پر ہمیں منزل من اللہ تورات، زبور، انجیل، اور جملہ آسمانی کتب اور صحائف پر ایمان لانا ضروری ہے مگر نہ اُن پر جن کا حال آپ نے دیکھ لیا اور جن میں انسانی ہاتھوں کی آمیزش ہے اور جن میں باقرار پادری صاحبان تحریف

واقع ہو چکی ہے تعالیٰ اللہ عن ذلک علواً کبیرا برق صاحب نے تورات وغیرہ کے غیر محرف ہونے پر قرآن کریم سے جو دو دلیلیں پیش کی تھیں ان کی حقیقت آپ سن چکے البتہ تیسری دلیل کہ یتلون آیات اللہ سے تورات وانجیل کی آیات مراد ہیں اور صالحین سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں) کا جواب باقی ہے سو وہ بھی سن لیجیے مفسرین کرامؒ نے تو خیر سے یہ بیان کیا ہی تھا کہ آیات اللہ سے قرآن کریم کی آیات اور صالحین سے وہ نومسلم یہودی مراد ہیں جو کلمہ پڑھ کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے جیسے حضرت عبداللہؓ بن سلام حضرت اسدؓ بن عبید اور ثعلبہؓ بن شعبہ وغیرہ (دیکھیے ابن کثیر ا ص ۳۹۷ و خازن ج ا ص ۵۶۹ و کشاف ا ص ۴۰۲ و مدارک ا ص ۵۶۹ وغیرہ) لیکن ہم برق صاحب کو محض مفسرین حضرات کی بیان کردہ تفسیر ہی سے مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ خود قرآن کریم سے اس کے متعلق پوچھتے ہیں کہ کیا مفسرین کا بیان کردہ مطلب صحیح ہے یا برق صاحب کا؟ ذیل کے امور پر اچھی طرح نگاہ ڈال کر حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کیجیے:-

۱- جن یہود اور نصاریٰ نے اسلام قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور رسالت سے انکار کیا کیا وہی اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل تعریف صالح اور نیک تھے؟ مگر برق صاحب ان کو مسلمان اور نیک کہتے ہیں جیسا کہ ایک اسلام اور دو اسلام میں انہوں نے اس کی تصریح کی ہے۔

۲- کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے اور قرآن کریم کے نزول کے بعد بھی تورات وانجیل پر عمل کرنا درست اور صحیح ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مذہب اسلام اور قرآن پہلے مذاہب اور سابق کتابوں کا ناسخ نہیں ہے کیا برق صاحب کا یہ عقیدہ اور مذہب ہے؟

۳- جن اہل کتاب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرامؓ پر

عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا اور جو ہر وقت اسی فکر میں رہتے تھے کہ حضور کو کیونکر قتل اور اسلام کو کس طرح مٹایا جائے کیا وہی تعریف کے مستحق اور نیک اور صالح ہونے کے اہل تھے؟

۴۔ اگر واقعی وہ صالح تھے تو حضور نے یہود بنی نضیر، بنی قینقاع اور بنی قریظہ سے جہاد کیوں کیا؟ کیا اسلام میں جہاد نیکوں اور صالحین سے کیا جاتا ہے یا نافرمانوں اور باغیوں سے؟

۵۔ اگر واقعی وہ لوگ صالح اور نیک تھے تو حضور نے ان کو مدینہ طیبہ سے خیبر کیوں جلاوطن کیا تھا؟ اور پھر حضرت عمرؓ نے خیبر سے بھی ان کو جلا وطن کر کے عرب کی سرزمین کو ان کے وجود نامسعود سے کیوں پاک کر دیا تھا؟ کیا اسلام میں نیکوں کو جلاوطن کیا جاتا ہے؟

۶۔ ان لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق جلاوطن کو دینا نہ لکھ دیا ہوتا تو ان کو دنیا میں وہ سزا دیتا اور آخرت میں ان کے لیے آگ کا عذاب ہوگا اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرے اللہ تعالے اس کو سخت عذاب دینے والا ہے (پ ۲۸۔ سورہ حشر۔ رکوع ۱ آیت ۲۔۳)

کیا ایسی سزا برقؔ صاحب کے نزدیک صالحین کے لیے تجویز کی جاتی ہے؟ اور کیا خدا کی مخالفت کرنا صالحین کا کام ہے؟ آپ نے دیکھا کہ ایک صحیح حدیث کے ابطال کے لیے برقؔ صاحب نے قرآن کریم کی کتنی آیات کی تحریف کی ہے اور بے شعوری کے عالم میں وہ کیا سے کیا کہتے اور لکھتے چلے گئے ہیں جو اس کا صحیح مصداق ہے کہ ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ ... نہ سمجھے خدا کرے کوئی

برقؔ صاحب کا حدیث پہ پانچواں اعتراض

(حدیث کی غلط بیانیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ) چہارم قرآن اور تاریخ ہر دو شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نہ لکھ سکتے اور نہ لکھی ہوئی چیز پڑھ سکتے تھے لیکن بخاری میں ہے کہ وہ لکھ سکتے تھے (دو اسلام صہ ۱۹۵) پھر آگے وہ حدیث نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں:۔

وَكَتَبَ هذا ما قاضى محمد بن عبد الله الخ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے لکھ دیا کہ یہ وہ فیصلہ ہے جو محمد بن عبد اللہ نے تسلیم اور طے کیا ہے الخ پھر آگے لکھتے ہیں کہ بخاری کی ایک اور روایت (ج ۲ صہ ۱۳۵) بتلاتی ہے کہ حضور نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا لفظ کھرچ ڈالا تھا اور کاتب نے ابن عبد اللہ کے الفاظ کا اضافہ کر دیا تھا اسی حدیث پہ باقی محدثین اعتماد کرتے ہیں اور تاریخ بھی اسی کی تائید کرتی ہے اس لیے لکھنے والی حدیث غلط ہے۔

(بلفظہٖ دو اسلام صہ ۱۹۵ و صہ ۱۹۶)

جواب:۔ یہ ٹھیک ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ کھرچ دیا تھا لیکن بخاری کی کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ لکھ سکتے تھے یہ برقؔ صاحب کی خود اپنی اختراع ہے درحقیقت بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے کاتب حضرت علیؓ کو لکھنے کا حکم دیا تھا اور انہوں نے لکھا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف لکھنے کی نسبت مجازی طور پہ کی گئی ہے دراصل آپ نے حکم دیا تھا علامہ نووی ؒ لکھتے ہیں کہ:۔

كتب معناه امر بالكتابة	كَتَبَ کا معنی یہ ہے کہ آپ نے لکھنے
كما يقال رجم ماعزاً و قطع	کا حکم دیا تھا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے

السارق وجلد الشارب ای امر بذلك واحتجوا بالروایة الاخری فقال لعلیؓ اکتب محمد بن عبد اللہ

(نووی شرح مسلم ص۱۰۵ ج۲)

کہ حضورؐ نے ماعزؓ کو سنگسار کیا چور کا ہاتھ قطع کیا، شرابی کو سزا دی یعنی آپؐ نے ان کو سزا دینے کا حکم دیا تھا جمہور کہتے ہیں کہ یہ مطلب اس سے بیان کیا گیا ہے کہ دوسری روایت میں تصریح ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؓ کو لکھنے کا حکم دیا تھا

اور حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ:۔

وھذہ محمولۃ علی الروایۃ الاخری ثم امر فکتب (تفسیر ابن کثیر ج۲ ص۱۷۰) کتب کی روایت دوسری روایت پر حمل کی گئی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پھر حضورؐ نے حکم دیا پس معاہدہ لکھا گیا۔ اور اس اسناد مجازی کے وقوع اور اس کے صحیح ہونے پر قرآن کریم، حدیث اور عرف سبھی متفق ہیں چنانچہ قرآن کریم میں یہود کی مذمت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا (پ۴۔ آل عمران۔ رکوع ۱۹) اب لکھ رکھیں گے ان کی بات کیا برق صاحب کے نزدیک خدا تعالیٰ بھی قلم دوات وغیرہ کے ذریعہ سے خود لکھا کرتا ہےؔ؟ اور اگر وہ خود نہیں لکھتا بلکہ فرشتوں کو لکھنے کا حکم دیتا ہے تو کیا کتابت کی نسبت مجازی طور پر آمر ہونے کے لحاظ سے خدا تعالیٰ کی طرف صحیح نہیں؟ اگر صحیح ہے تو حدیث کا بھی ایسا ہی معنیٰ سمجھ لیں اور اگر حدیث اس لیے مخدوش اور متروک ہے کہ اس میں جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لکھنے کی نسبت کی گئی

؎ خود برق صاحب لکھتے ہیں کہ کیا ہر انسان کے اعمال اللہ خود لکھ رہا ہے؟ ہر کرہ سماوی کو وہ خود کھینچ رہا ہے؟ ہر مکھی اور مچھر کے انڈے میں سے اپنے ہاتھ سے بچہ بنا رہا ہے؟ (بلفظہٖ ایک اسلام ص۲۶۶)

ہے تو قرآن کریم کی اس آیت کا بھی انکار کر دینا چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف لکھنے کی نسبت کی گئی ہے ایک دوسرے مقام پر منافقین کی تردید کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ رپ۵ ۔سورۃ النساء رکوع) اور اللہ تعالیٰ لکھتا ہے جو مشورے منافق لوگ رات کو کیا کرتے ہیں ۔

یہاں بھی اس کے سوا اور کیا معنیٰ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو (جن کو عموماً کرام کاتبین سے ذکر کیا جاتا ہے) لکھنے کا حکم دیتا ہے اور لکھنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف باعتبار آمر اور حاکم ہونے کے ہے اور حدیث میں آمر کی طرف فعل کی نسبت کی چند مثالیں امام نوویؒ کی عبارت میں گذر چکی ہیں اور عرف عام میں بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں مسجد فلاں بادشاہ نے بنائی ہے اور فلاں قلعہ اور فلاں عمارت فلاں بادشاہ کی تعمیر کردہ ہے کیا اس کا یہ مطلب لیا جایا کرتا ہے کہ بادشاہ نے خود اینٹ اور پتھر سیمنٹ اور کیچڑ سر پر اٹھا کر اس کو تعمیر کیا ہوتا ہے ؟ سب لوگ بادنیٰ غور سمجھ جاتے ہیں کہ بادشاہ کے حکم سے کاریگروں اور مزدوروں نے مسجد اور قلعہ وغیرہ تعمیر کئے ہیں ۔ یا مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں جرنیل نے فوج کو پسپا کر دیا ہے سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ اسناد مجازی ہے درحقیقت فوج کو شکست دینے والے اس کے سپاہی اور ماتحت فوجی ہوتے ہیں اور کوئی بھی ان مثالوں میں بادشاہ اور جرنیل وغیرہ کی طرف اسناد کو غلط اور باطل نہیں قرار دیتا لیکن برقؔ صاحب کی منطق کی نرالی اور تحقیق ہی عجیب ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک قرآن و حدیث اور عرف عام کوئی چیز قابل قبول نہیں ہاں البتہ ان کے دماغ میں کوئی چیز آجائے تو وہ محکم اور اٹل ہو جاتی ہے خواہ اس کے خلاف براہین اور دلائل کا ایک انبار بھی کیوں نہ موجود ہو۔

برقؔ صاحب نے طبع ششم ص۱۱ میں یہ لکھا ہے کہ بعض شارحین بخاری نے

فَكَتَبَہٗ کے معنی فامر بکتابتہ کے ہیں اور یہ وہ معنی ہیں جو کسی لغات میں نہیں ملتے انتھٰی

الجواب :۔ یہ برق صاحب کی محض طفل تسلی ہے کیونکہ کتب لغت اسناد مجازی سے بھری پڑی ہیں اور ہر زبان کی کتب لغات میں اسناد مجازی کی بے شمار مثالیں موجود ہیں جس کا انکار کرنا مکابرہ اور ضد ہے۔ اور ابھی ہم نے باحوالہ اس کی مثالیں عرض کر دی ہیں۔

برق صاحب کا حدیث پر چھٹا اعتراض

حدیث کا علم التاریخ بخاری و مسلم کے چند تاریخی شاہکار صفحات گذشتہ میں درج ہو چکے ہیں ایک دو اور سنئے اور داد دیجئے :۔ ابوہریرہؓ حضور سے راوی ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ختنہ اسّی برس کی عمر میں ہوا انتھٰی (بخاری ج ۲ ص ۱۵۲) راوی نے یہ نہ بتایا کہ پورے اسّی سال تک اس مبارک کام میں کون سی رکاوٹ حائل رہی جو وفات سے عین پہلے دور ہوئی اور آپ بااں ضعف و پیری حجام کے سامنے جا بیٹھے ختنہ کا مقصد صفائی صحت اور جنسی لذتوں میں اضافہ ہے اسّی برس کے بعد یہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے تو پھر ختنہ سے فائدہ؟ انتھٰی۔ (بلفظہ دو اسلام ص ۲۳۹ طبع اوّل اور اب طبع ششم میں اس کو حذف کر دیا ہے۔)

جواب :۔ برق صاحب نے حدیث کے ترجمہ میں خیانت یا جہالت کا ثبوت دیا ہے بخاری وغیرہ کی اصل روایت یوں ہے :۔

اختتن وقد اتت علیہ ثمانون سنۃ (بخاری ج ۱ ص ۴۷۳ و مسلم ج ۲ ص ۲۶۵ و ادب المفرد ص ۱۸۲) کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسّی سال پورے ہو چکنے کے بعد اپنا ختنہ خود کیا تھا۔ عربی کا ادنیٰ طالب علم بھی اس بات کو بخوبی جانتا ہے کہ اختتن باب افتعال کی ماضی ہے جو لازمی اور متعدی دونوں طریق سے مستعمل ہے اور جس کے معنی خود اپنا ختنہ کر لینے کے بھی ہیں نہ کہ حجام کے سامنے جا بیٹھنے اور

اس سے ختنہ کرانے کے جیسا کہ برقؔ صاحب نے سمجھا ہے اور اسے پرضعف اور پیری کی حالت میں حجام کے سامنے جا بیٹھنے کا قابلِ رشک حاشیہ چڑھایا ہے اور مزید براں یہ گوہر افشانی فرمائی ہے کہ یہ ختنہ وفات سے عین پہلے ہوا جس سے لظر بظاہر عرف عام میں یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ شاید وفات سے صرف چند ہی دن قبل ختنہ ہوا تھا یہ تو بیان ہو چکا ہے کہ اسی ۸۰ سال کے بعد ختنہ ہوا اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دو ۲۰۰ سو سال کی عمر تھی (دیکھئے ادب المفرد ص ۱۸۳ والبدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۷۴ وغیرہ) گویا اس لحاظ سے حضرت ابراہیمؑ نے ختنہ کے بعد ایک سو بیس ۱۲۰ برس کی عمر پائی تھی اور شاید برقؔ صاحب کی اصطلاح میں اتنا طویل عرصہ عین وفات سے قبل کا زمانہ تصور ہو گا ؎

نام اس کا آسماں ٹھہرا لیا تحریر میں

رہا یہ سوال کہ اسی ۸۰ سال تک ختنہ کرنے سے کیا چیز مانع تھی؟ تو یہ سوال ہی نظام تشریعی سے ناواقفی کی دلیل ہے جب اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں ہوا تھا ختنہ نہیں کیا تھا اور جب حکم ہو گیا کر لیا تھا جیسا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جب کام کاج کے قابل ہو گئے تھے (فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ) اور جب کہ ان کی عمر تیرہ ۱۳ برس کی ہو چکی تھی (دیکھئے مدارک ۵ ص ۲۴۲ و بیضاوی ۵ ص ۳۴۲ وغیرہ) تو اس وقت ان کو ذبح کے لیے پیش کیا گیا حالانکہ قربانی اس سے پہلے بھی ہو سکتی تھی برقؔ صاحب ہی فرما دیں کہ ۱۳ برس کی عمر سے پہلے کیا چیز مانع تھی؟ جو دلیل وہ اس کی اور اس کے علاوہ دیگر بے شمار احکام کی بیان کریں گے وہی ہماری طرف سے حدیث مذکور کی دلیل سمجھ لیں۔ لیجئے برقؔ صاحب کی مستند اور غیر محرف تورات کے حوالے سن لیں اگر حدیث ان کے نزدیک حجت نہیں تو شاید تورات ہی ان کی تسلی کرا دے۔ تورات کتاب پیدائش باب، آیت ۲۴ میں ہے ابرہام ننانوے ۹۹

برس کا تھا جب اس کا ختنہ ہوا اور باب ۱۷ آیت ۲۶ میں ہے ابراہام اور اس کے بیٹے اسمعیل کا ختنہ ایک ہی دن ہوا۔ اور باب ۲۵ آیت ۷ میں مذکور ہے اور ابراہام کی کل عمر جب تک کہ وہ جیتا رہا ایک سو پچھتر ۱۷۵ برس کی ہوئی۔

حدیث میں تو اسی برس کی عمر بیان ہوئی تھی جس کا علم التاریخ فہم و ادراک سے بالاتر رہا لیکن برق صاحب کی مستند کتاب میں ننانوے ۹۹ برس کی عمر بیان کی گئی ہے دیکھئے وہ اس ننانوے ۹۹ کے پھیر سے نکلنے کا کیا حل تجویز کرتے ہیں؟

برق صاحب کا حدیث پر ساتواں اعتراض

لکھتے ہیں۔ کیا رکوع و سجود میں قرآن پڑھنا جائز ہے؟ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے انی نہیت ان اقرأ القرآن راکعا او ساجدا (مسلم ۲ ص ۹۲) حضور فرماتے ہیں کہ مجھے رکوع و سجود میں قرآن پڑھنے سے روک دیا گیا ہے حضرت علیؓ کا قول ہے:۔

نہانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اقرأ القرآن راکعا او ساجدا (مسلم ص ۹۲) مجھے حضور نے رکوع و سجود میں قرآن پڑھنے سے روک دیا ہے لیکن حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول فی رکوعہ وسجودہ سبوح قدوس رب الملئکۃ والروح (مسلم ۲ ص ۹۶) کہ حضور رکوع و سجود میں قرآن کی یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔ سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَالرُّوحِ ۔ مطلب یہ کہ حضور ایک حکم دے کر خود ہی اُسے توڑ دیا کرتے تھے۔ (انتہٰی بلفظہٖ دو اسلام ص ۲۴۲ و ص ۲۴۳ طبع اول اور اب طبع ششم میں اسے اڑا دیا گیا ہے)۔

جواب:۔ جو قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے بواسطہ جبرائیل علیہ السلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور جو صحیح اور اصلی حالت میں آج بھی مسلمانوں

کے ہاتھوں میں موجود ہے اور جس کے تیس ۳۰ پارے ہیں اس قرآن کریم میں برق صاحب کی یہ آیت کہیں موجود نہیں ہے مہربانی فرما کر ہمیں یہ آیت بتلا دی جائے دیدہ باید ہاں اگر ان کا کوئی الگ قرآن ہے جس کی یہ آیت ہے تو اس کا ہمیں علم نہیں ہے وہ جانیں اور ان کا قرآن صاحب البیت ادری بما فیہ۔ شاید یہ اُس قرآن کی آیت ہو جس کی طرف برق صاحب اور ان کے دیگر ہمنوا دوست اور احباب دعوت دیتے رہتے ہیں اور کیا بعید ہے کہ مُلّا بے چارہ بھی صرف اسی قرآن کا منکر ہو جس کی یہ فرضی آیت ہے اور برق صاحب نے دو قرآن نامی کتاب لکھ کر یہ حقیقت آشکارا کر دی ہے کہ مُلّا کا قرآن اور ہے اور ان کے احباب کا قرآن اور۔ لہذا ہمارا یہ بیان تعدی پر مبنی نہیں ہے۔ ع

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی

لطیفہ:۔ محدثین کرام کا یہ طریقہ ہے کہ حدیث کی اکثر کتابوں میں سوائے آیات قرآنیہ، ادعیہ ماثورہ اور مشکل الفاظ کے اعراب نہیں لگایا کرتے آیات قرآنیہ بعض ادعیہ اور مغلق الفاظ پر اس لیے اعراب ثبت کر دیا کرتے ہیں تاکہ ان کو غلط پڑھنے سے اجتناب کیا جا سکے یوں معلوم ہوتا ہے کہ برق صاحب نے اس مذکور دعا پر بعض اعراب دیکھ کر خوش فہمی سے اسے قرآن کریم کی آیت سمجھ لیا ہے اور پھر اس پر اعتراض کی عمارت کھڑی کر دی ہے سہ

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج!

نکتہ:۔ رکوع کی حالت میں جب بھی کوئی شخص جھک کر جاتا ہے تو اپنی ذلت عجز اور کمزوری کا خدا تعالیٰ کے سامنے عملاً اقرار کرتا ہے اور سجدہ تو انتہائی انکساری فروتنی اور تواضع کا مقام ہے اور حقیقت اللہ تعالیٰ کے سامنے اور اس کے

حضور میں یہی عاجزی اور تذلل تمام سربلندیوں اور ترقیوں کا آخری مقام ہے اللہ تعالیٰ کا کلام (قرآن کریم) چونکہ صد تعظیم و تکریم کا مستحق ہے اس لیے ان دونوں حالتوں میں قرآن پڑھنے سے روک دیا گیا تاکہ کسی کو یہ وہم اور شبہ پیدا نہ ہو کہ کلامِ پاک کو پستی کی طرف جھکایا جا رہا ہے۔ ع

یہ اپنی حدِ نظر ہے کسی کی دید کہاں

برق صاحب کا حدیث پر آٹھواں اعتراض

وقتِ عصر۔ بخاری کی حدیث ہے کہ ابردوا بالصلوٰۃ (نماز کو ذرا ٹھنڈے وقت میں پڑھو) لیکن بخاری ہی میں ایک اور حدیث ہے۔ انس رضؓ بن مالک کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز عصر اتنی جلدی پڑھ لیتے تھے کہ اگر ہم نماز پڑھ کر عوالی (مدینہ سے چار میل) سے بھی پھر آتے تو سورج کافی اونچا ہوتا تھا۔ (بخاری ج ۱ ص ۷۲) انگریزی میل ۱۷۶۰ گز لمبا ہوتا ہے اور عربوں کا پرانا میل ۲۴۵۵ گز اس حساب سے عوالی اور مدینہ کا دوطرفہ سفر گیارہ میل اور ایک فرلانگ بنتا ہے جس پر درمیانی رفتار سے کم از کم چار گھنٹے صرف ہوتے ہیں انسؓ کہتے ہیں کہ عوالی سے واپس آنے کے بعد بھی سورج کافی اونچا ہوتا تھا یعنی اس کے غروب میں کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہوتا تھا بدیں الفاظ حضور نماز عصر غروب آفتاب سے ساڑھے پانچ گھنٹے پہلے پڑھا کرتے تھے سردیوں میں سورج سوا پانچ اور گرمیوں میں ساڑھے سات بجے ڈوبتا ہے تو گویا سرما میں نماز عصر دن کے پونے بارہ بجے پڑھی جاتی تھی اور گرمیوں میں دو بجے بعد از دوپہر، قربان جاؤں اس وحی خفی پہ (بلفظہٖ دو اسلام ص ۲۴۷ طبع اوّل اور اب طبع ششم میں سے اسے حذف کر دیا گیا ہے)

جواب:۔ مجتہد اگرچہ دنیا میں بے شمار پیدا ہوئے ہیں مگر برق صاحب کا اجتہاد تو چیزے دیگر ست اس اعتراض میں ان کے مرکزی مقدمات تین ہیں

جن کا جواب لابدی اور ضروری ہے اور ضمنی امور سے بخوف طوالت گریز کیا گیا ہے۔

۱۔ ابردوا بالصلوٰۃ کی حدیث عصر کی نماز پر چسپاں کی گئی ہے اور اس پر سوال کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ ۲۔ نماز عصر کے بعد عوالی پہنچ کر پھر واپس مدینہ طیبہ لوٹنے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ ۳۔ اور عربوں کے میل کی ۲۴۵۵ گز مقدار بیان کی گئی ہے۔ آپ ترتیب وار ہر ایک مقدمہ کا جواب سُننے جایئے :۔

پہلے مقدمہ کا جواب

ابردوا بالصلوٰۃ کی حدیث کا مصداق عصر کی نماز نہیں بلکہ ظہر کی نماز ہے چنانچہ بخاری وغیرہ میں حضرت ابوسعید الخدریؓ وغیرہ کی روایت میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے۔ قال علیہ السلام ابردوا بالظھر الخ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا کہ ظہر کی نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھا کرو اور حضرت ابوذرؓ کی ابردو والی حدیث میں بھی ظہر کی نماز کا خاص طور پر ذکر موجود ہے (دیکھئے بخاری ج ۱ ص ۷۷ مسلم ج ۱ ص ۲۲۴ وابوعوانہ ج ۱ ص ۳۴۷ وغیرہ) آپ نے ملاحظہ کیا کہ برقؔ صاحب نے کیسی کھلی جبارت یا غفلت کا ثبوت دیا ہے کہ ظہر کا لفظ ہضم کر کے اپنی طرف سے عصر کا لفظ حدیث میں ڈال کر اس کو عصر کی نماز پر چسپاں کر کے وحی خفی پر قربان ہونے پر اُتر آئے ہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی عقل سے تمسخر اڑاتے حدیث سے مسخرہ شروع کر دیا ہے فوا اسفا علاوہ بریں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ظہر کی نماز کی تاخیر اور ابراد کی وجہ تو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اسی حدیث میں شدۃ حر (سخت گرمی) بیان کی ہے اور یہی بات علت ابراد ہے مگر برقؔ صاحب بلاوجہ موسم سرما کا ذکر بھی اس میں چھیڑ رہے ہیں تاکہ صحیح بات مکمل بے مزہ ہو جائے۔

دوسرے مقدمہ کا جواب :۔

حضرت انسؓ کی (عوالی والی) جس روایت کا حوالہ درج کیا گیا ہے وہ

دراصل یوں ہے :۔

عن انسؓ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یصلی العصر والشمس مرتفعۃ حیّۃ فیذھب الذاھب الی العوالی فیاتیھم والشمس مرتفعۃ وبعض العوالی من المدینۃ علٰی اربعۃ امیال اونحوہ (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۶۰)	حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم عصر کی نماز پڑھا کرتے تھے جب کہ سورج اونچا اور بغیر سُرخی کے اصلی حالت میں ہوتا تھا اور جانے والے جب عوالی میں پہنچتے تو سورج اُونچا ہوتا تھا اور بعض عوالی مدینہ طیبّہ سے تقریباً چار میل دور واقع تھے۔

خط کشیدہ عبارت دیکھئے اور برقؔ صاحب کے اجتہاد کی داد دیجئے حضرت انسؓ یکطرفہ سفر کا ذکر رہے ہیں اور برقؔ صاحب واپسی کا سفر بھی ساتھ شامل کر کے گیارہ میل اور ایک فرلانگ کی مقدار بتاتے ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ پہنچنے والا جب عوالی پہنچتا تھا تو سورج اونچا ہوتا تھا اور برقؔ صاحب کافی کی قید، اپنی طرف سے زائد کر کے لکھتے ہیں کہ سورج کافی اونچا ہوتا تھا۔ ع

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

ہم نے جو مطلب بیان کیا ہے وہ اختراع اور ایجاد بندہ نہیں بلکہ خود روایت ہی میں اس کی تصریح موجود ہے جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے اور ایک اور روایت اس مطلب کو واضح سے واضح تر کر دیتی ہے فیذھب الذاھب الی العوالی فیاتی العوالی والشمس مرتفعۃ (مسلم ج ۱ ص ۲۲۵) جانے والا عوالی کو جاتا اور جب عوالی میں پہنچتا تو سورج اُونچا ہوتا تھا اور ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ جانے والا جب بنی عمرو بن عوف کی آبادیوں میں پہنچتا تو سورج اونچا ہوتا تھا یہ آبادیاں مدینہ منورہ سے دو میل کی مسافت پر واقع تھیں (نووی شرح مسلم ج ۱ ص ۲۲۵)

یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ سورج کی اونچائی عُرفی اور اضافی چیز ہے جس کی علی التعیین حد بندی مشکل ہے۔ غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ قبل پر بھی والشمس مرتفعۃ[1] کا اطلاق درست ہے اور آدھ گھنٹہ بلکہ اس سے کچھ منٹ کم پر بھی یہ اطلاق صحیح ہے جیسا کہ قبا پہنچنے پر بھی مرتفعۃ کا اطلاق ہوا ہے جو تین میل پر واقع ہے اور بنی عمرو بن عوف کی بستیوں میں پہنچنے پر بھی اطلاق واقع ہوا ہے جو مدینہ سے صرف دو میل دور تھیں۔ اب برق صاحب ہی ارشاد فرمائیں کہ دو یا تین میل کی مسافت طے کرنے کے لیے کتنا وقت درکار ہوگا؟ جب کہ اس دورِ انحطاطِ قوائے جسمانیہ میں اوسطاً چار بلکہ پانچ میل کی مسافت گھنٹہ میں بھی طے کی جاتی ہے تو کیا اُس وقت جب کہ لوگوں کو پیدل چلنے کی کافی مہارت اور مشق تھی تین میل کی مسافت آدھ یا پون گھنٹے میں طے نہیں ہو سکتی تھی؟ اور حدیث میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں کہ جانے والے اونٹ یا گھوڑے پر سوار ہو کر جاتے تھے یا پیدل؟ جوان اور طاقتور جاتے تھے یا بوڑھے اور کمزور؟ گرمی میں یہ سفر طے ہوتا تھا یا سردی میں؟ کیونکہ گرمی اور سردی میں غروب آفتاب کا تفاوت برق صاحب کو بھی مسلّم ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ اچھا آپ ارتفاع شمس کے لیے پون گھنٹہ اور تین میل کی مسافت طے کرنے کے لیے بھی پون گھنٹہ ہی تسلیم کر لیجیے پھر بھی یہی ثابت ہوگا کہ عصر کی نماز کے بعد غروب آفتاب تک ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہوتا تھا اور آج بھی مسلمانوں کی اکثریت غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے

---

[1] (مسلم ج ۱ ص ۲۲۳) میں ایک روایت ہے کہ حضور نے عصر کی نماز اوّل وقت میں پڑھائی اور سورج اونچا تھا والشمس مرتفعۃ اور دوسرے دن عصر کی نماز آخر وقت میں پڑھائی اور سورج اونچا تھا والشمس مرتفعۃ یہ روایتیں اس امر کی واضح دلیل ہے کہ سورج کی اونچائی ایک اضافی امر ہے۔ ۱۲ ابو الزاہد۔

نمازِ عصر پڑھتی ہے لیکن برقؔ صاحب ہیں کہ سردیوں میں عصر کی نماز پونے بارہ بجے اور
گرمیوں میں دو بجے بعد از دوپہر پڑھوانے پر تلے ہوئے ہیں ؎

ٹھوکریں مت کھا بیٹے چلیئے سنبھل کر دیکھ کر
چال سب چلتے ہیں لیکن بندہ پرور دیکھ کر

تیسرے مقدمہ کا جواب

برقؔ صاحب نے عربوں کے پرانے میل کی جو مقدار (۲۴۵۵ گز) بتلائی ہے نہ معلوم اس کا ماخذ کیا ہے؟ محقق صاحب جانیں اور ان کی قدیم عرب قوم اور ان کا میل اور اس کی مقدار۔ فقہاء کرام کے ہاں شرعی میل کی مقدار یہ ہے کہ ہر میل چار ہزار ذراع کا ہوتا ہے اور ہر ذراع چوبیس انگشت کی اور ہر انگشت چھ جو کی (جو عرض میں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر رکھے جائیں) اور ہر جو خچر کے چھ بالوں کی مقدار میں جو (عرض میں جوڑ کر رکھے جائیں) فقہ کی مستند کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ (مثلاً در مختار ص۲۱۵ ج۱ وغیرہ) اور علامہ ابن عابدینؒ نقل کرتے ہیں ھوالمشہور کہ یہی مشہور ہے وھوالمعول علیہ اور اسی پر اعتماد ہے (شامی ج۱ ص۲۱۵) اور غایۃ الاوطار ج۱ ص۳۱۹ میں لکھا ہے کہ ہر ذراع انسان کی دو بالشت کی مقدار کی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے عربی میل دو ہزار گز لمبا ہوگا اور انگریزی اور عربی میل میں تفاوت صرف ۲۴۰ گز کا ہوگا بالفاظ دیگر عربی کے تقریباً سات میل انگریزی کے تخمیناً آٹھ میل کے برابر ہوں گے یہ تھی حقیقت جو برقؔ صاحب پر ایک معمہ بن کر رہ گئی ہے اگر وہ ذرا بھی غور و فکر سے کام لیتے تو پیچ در پیچ غلطیوں کا ہرگز ارتکاب نہ کرتے ؏

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است

برقؔ صاحب کا حدیث پر نواں اعتراض

ایک حدیث نقل کرکے اس پر حاشیہ چڑھاتے ہیں جب کوئی شخص وضو

میں منہ دھوتا ہے تو اس کی آنکھوں کے سب گناہ (بیگانہ عورت کو دیکھنا وغیرہ) معاف ہوجاتے ہیں ہاتھ دھونے سے ہاتھوں کے اور پاؤں دھونے سے پاؤں کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں (مسلم ج ا ص ۱۲۵) ہے کوئی ایسا گناہ جس میں ہاتھ پاؤں اور آنکھ کی مدد شامل نہ ہو؟ زنا، چوری، ڈاکہ، شراب نوشی، جوا، قتل سب کے سب انہی اعضا کی مدد سے سرزد ہوتے ہیں ایک مرتبہ وضو کیا اور دست و رُو کے غبار کی طرح سب گناہ ڈھل کر بدرد میں بہہ گئے صرف ایک بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جب وضو سے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں تو حضور اور حضور کے خلفائے مسلمانوں پہ زنا، سرقہ اور شراب نوشی کی حدود کیوں جاری کی تھیں؟ جب وضو کے بعد گناہ رہتا ہی نہیں تو پھر سزا دینے کا کیا مطلب؟ کیا وہ سزا دے کر اس حدیث کے جھوٹا ہونے کا اعلان کیا کرتے تھے یا یہ بتایا کرتے تھے کہ ہم کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ اور (بلفظہ دو اسلام ص ۲۸۴،۲۸۳ طبع اول اور ص ۲۸۷ و ص ۲۸۸ طبع ششم)

جواب :۔ برق صاحب اگر ذرا سی تکلیف گوارا فرما کر صحیح مسلم وغیرہ کی روایت کا یہ ٹکڑا بھی ملاحظہ فرما لیتے تو ان کو بلا ضرورت حاشیہ آرائی کی ہرگز ضرورت نہ پڑتی اور بیک نگاہ حقیقت ان کے سامنے آجاتی۔

کفارة لما قبلها من الذنوب مالم یأت کبیرة (مسلم ج ا ص ۱۲۱ و مشکوٰة ج ا ص ۲۸ والتاج الجامع ا ص ۱۳۶) کہ وضو وغیرہ سے ماقبل زندگی کے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں بشرطیکہ کوئی کبیرہ گناہ سرزد نہ ہوا ہو۔ اس روایت سے صاف طور پہ معلوم ہوا کہ وضو وغیرہ نیکیوں سے صرف عام لغزشیں اور صغائر معاف ہوتے ہیں باقی رہے کبائر اگر تو حقوق اللہ میں سے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی مشیت پہ موقوف ہیں چاہے سزا دے چاہے معاف کردے اور خلوص نیت سے توبہ و استغفار کرنے سے بھی معافی کا ثبوت قرآن و سنت سے ملتا ہے اور حقوق العباد

میں صاحب حق کو حق ادا کرنا یا اس سے معافی لینا ضروری ہوتا ہے، رہا قتل، چوری ڈاکہ زنا اور شراب نوشی وغیرہ تو سب کے سب کبائر میں داخل ہیں ان میں شرعی ثبوت کے بعد باقاعدہ حدود جاری ہوں گی اور وضو وغیرہ سے یہ معاف نہیں ہوتے اگر برق صاحب انصاف اور دیانت سے کام لیتے تو ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدینؓ کے قول و فعل میں نہ تو تضاد نظر آتا اور نہ حدیث کے جھوٹا ہونے کے اعلان کی ضرورت پڑتی علاوہ بریں کیا وضو نیکی کی مد میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کس دلیل سے؟ اور اگر ہے اور یقیناً ہے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے ۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ط (پ ۱۲۔ سورہ ہود۔ رکوع ۱۰) تحقیق سے نیکیاں لے جاتی (اور فنا کر دیتی) ہیں برائیوں کو۔

اگر وضو کی برکت سے جو نماز جیسی عظیم المرتبت عبادت کی مفتاح اور شرط ہے اللہ تعالیٰ انسانوں کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں اور کوتاہیوں کو معاف کر دے تو برق صاحبؒ کا کیا نقصان ہوتا ہے؟ اگر وہ چاہے تو بغیر وضو وغیرہ کے از روئے مہربانی اور عنایت کے صغائر کو معاف کر دے تو کر سکتا ہے بلکہ کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے ۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ ۔ الآیۃ (پ ۵، نساء۔ ۵) اگر بچو گے تم بڑے گناہوں سے جن سے تم منع کیے جاتے

ؒ لیجئے برق صاحب خود بول اٹھے۔ جس طرح بعض نیک اعمال تمام چھوٹی بڑی غلطیوں اور لغزشوں کو ڈھانپ لیتے ہیں اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ بعض نیکیاں برائیوں کو ڈھانپ لیتی ہیں الخ (ایک اسلام ص ۶۹)

ہو تو ہم تمہاری لغزشیں مٹا دیں گے۔ جب وہ محض اجتناب کبائر سے چھوٹی چھوٹی لغزشیں معاف کرنے کا وعدہ کرتا ہے تو وضو کو اگر معافی کا ایک ذریعہ اور بہانہ بنا دے تو اس میں کیا خرابی اور قباحت پیدا ہوتی ہے؟ ؎

رحمتِ حق بہا نمی جوید

رحمتِ حق بہانہ می جوید

برق صاحب کا حدیث پر دسواں اعتراض

مسلم کی ایک حدیث ہے:۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یقطع الصلوٰة المرأة والحمار والکلب۔ ابوہریرہؓ حضور سے روایت کرتے ہیں کہ عورت گدھا اور کتا سامنے آجائیں تو نماز ٹوٹ جاتی ہے (مسلم ۲ ص۱۱۱) لیکن حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں:۔

کنت انام بین یدی رسول الله صلی الله علیه وسلم ورجلی فی قبلته فاذا سجد غمزنی قمضت رجلی فاذا قام بسطتها والبیوت لیس فیها مصابیح (بخاری ج ۱ ص۵۵) کہ میں نماز میں حضور کے سامنے پاؤں ان کی طرف پھیلا کر لیٹ جاتی تھی جب وہ سجدہ کرنے لگتے تو مجھے آنکھ سے اشارہ کر دیتے چنانچہ میں پاؤں سمیٹ لیتی اور جب وہ اُٹھتے تو پھر پھیلا دیتی اور گھر میں چراغ موجود نہیں تھا (یعنی بالکل اندھیرا تھا) یہ اندھیرے میں رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے اشارہ ابرو کو دیکھ لینا حضرت عائشہؓ ہی کا کمال ہو سکتا ہے اس روایت کے مطابق حضرت عائشہؓ حضور کے مصلّے پر لیٹ رہتی تھیں اور پہلی کے مطابق عورت کے سامنے آنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے کس کو صحیح سمجھیں؟ (بلفظہٖ دو اسلام ص۲۴۴ طبع اول و ص۲۴۷ و ص۲۴۸ طبع ششم)

جواب :۔ حضرت عائشہؓ کا کمال تھا یا نہ تھا یہ بات تو اپنی جگہ پر رہیگی مگر برقؔ صاحب نے تو کمال کر ہی دکھایا ہے ہم مقدمہ میں عرض کر چکے ہیں کہ وہ تمام الفاظ کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کے عادی ہیں جہاں غمز کے معنیٰ آنکھ سے اشارہ کرنے کے آتے ہیں وہاں یہ بھی لکھا ہے واصل الغمز العصر (مغرب ج ۲ ص ۸۷) غمز کے اصلی معنیٰ ہاتھ سے دبانے اور نچوڑنے کے ہیں اور مجمع البحار ج ۳ ص ۴۵ میں ہے الغمز العصر والکبس بالید اور منجد ص ۵۸۸ میں لکھا ہے غمز غمزہ اجسّہٗ وکبسہ بالید یعنی غمز کے معنیٰ ہاتھ سے کسی چیز کو ٹٹولنے اور دبانے کے آتے ہیں اور صراح ص ۲۲۶ میں لکھا ہے دست نہادن بر دنبۂ و پہلوئے گوسپند تا فربہی و لاغری معلوم شود۔

برقؔ صاحب ہی فرمائیں کہ ہاتھ کے ساتھ ٹٹولنے اور دبانے سے باخبر اور بیدار ہونے کی خوبی اور کمال کیا صرف حضرت عائشہؓ کے ساتھ مخصوص ہے یا کسی اور میں بھی اس کا تحقق ہو سکتا ہے؟ برقؔ صاحب کا ایک اور کمال ملاحظہ کیجئے لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ حضور کی طرف پاؤں پھیلا کر لیٹ جاتی تھی۔ حالانکہ روایت میں اس کی تصریح موجود ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں آپ کے سامنے جنازہ کی طرح لیٹ جاتی تھی (مسلم ج ۱ ص ۱۹۷ ونسائی وقال الحافظ فی التلخیص اسنادہ صحیح نیل الاوطار جلد ۱ ص ۱۹۱) ہاں اگر برقؔ صاحب کے علاقہ میں یا اُن کی خاص اصطلاح میں بوقتِ جنازہ میت کی ٹانگیں امام کی طرف پھیلا کر رکھی جاتی ہیں تو لامشاحۃ فی الاصطلاح اور انکی اس اصطلاح اور تحقیق انیق پر شاید کوئی مجذوب ان سے یوں خطاب کرے ؎

صراحی در بغل ساغر بکف مستانہ وار آجا
لگائے آسرا بیٹھا ہے اک مستانہ برسوں سے

اب رہا دونوں حدیثوں کے آپس میں تعارض کا جواب، تو وہ بھی سُن لیجئے

نمازی کے سامنے سے جب بھی کوئی چیز گذرے گی تو یقیناً نمازی کی توجہ مناجات خداوندی سے ہٹ کر دوسری طرف مائل ہو جائے گی اور نماز کا خضوع و خشوع باطل ہو جائے گا حالانکہ نماز کی اصل روح ہی یہی ہے اور خصوصاً عورت کا سامنے سے گذرنا تو اپنی فطرتی جاذبت اور کشش کی وجہ سے اکثر موجب فتنہ ہوتا ہے ہاں اگر کوئی شخص بالفرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح استغراق تجلیات میں پورا منہمک ہو اور دنیا کی کوئی چیز بھی اس کے لیے سدراہ نہ ہو تو علیحدہ بات ہے یا کوئی محرم اور اپنی ہی بیوی ہو تو شاید کہ وہ اس فتنے سے ایک حد تک محفوظ رہے لیکن اگر کسی غیر محرم اور اجنبی عورت کا نمازی کے سامنے سے گذر ہو خصوصاً جب کہ وہ جواں سال اور خوب صورت بھی ہو تو اس کے موجب فتنہ ہونے میں کیا شبہ ہے؟ اسی طرح کتا، گدھا، یہودی، مجوسی اور خنزیر وغیرہ (جیسا کہ ابوداؤد ج ۱ ص ۱۰۲ اور نسائی ج ۱ ص وغیرہ کی روایتوں میں ان کا ذکر بھی آتا ہے۔ التاج الجامع للاصول ج ۱ ص ۱۷۹) جب نمازی کے سامنے سے گذریں گے تو چونکہ فطرتاً مسلمانوں کو ان سے نفرت ہوتی ہے ان پر نگاہ پڑتے ہی نماز کے اندر ہی اس کو طیش اور غصہ آئے گا اور توجہ الی اللہ سے رُخ پھر جائے گا عورت صنف نازک ہونے کی وجہ سے مرغوب اور پسندیدہ اشیاء میں داخل ہے اور کتا اور گدھا وغیرہ مبغوض اور ناپسندیدہ اشیاء ہیں۔ تو اس حدیث میں بظاہر حصر نہیں کی گئی بلکہ مرغوب و مبغوض اشیاء میں سے بعض کو بطور مثال پیش کر دیا گیا ہے۔ اور اس حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے گذرنے سے نماز ہی باطل و فاسد ہو جاتی ہے بلکہ مُراد صرف اتنی ہے کہ نماز کا خشوع و خضوع قطع ہو جاتا ہے اور اس میں کسی عقلمند کو شبہ نہیں ہو سکتا؟ اور جس روایت میں نماز نہ ٹوٹنے کا ذکر آتا ہے وہ اپنے ظاہری الفاظ اور مفہوم پر محمول ہے فریضہ بہر حال ادا ہو ہی جائے گا یہ دوسری

بات ہے کہ خشوع وخضوع نہ ہے۔ قرآن کریم سے متعدد مثالیں اس پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر ہم صرف ایک ہی مثال عرض کر دیتے ہیں تاکہ حقیقت اچھی طرح عیاں اور آشکارا ہو جائے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ الآیۃ۔ (پ۳ سورہ آل عمران۔ رکوع) کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مجرموں اور نافرمانوں سے گفتگو نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف نظر کرے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا۔ اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:۔ فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ ۔ (پ۱۴۔ سورہ الحجر۔ رکوع۶) سو تیرے رب کی قسم ہم ضرور بضرور (قیامت کے دن) اُن مجرموں سے سوال کریں گے پہلی آیت بتلا رہی ہے کہ قیامت کے دن مجرموں سے اللہ تعالیٰ ہرگز کلام نہ کرے گا۔ اور دوسری آیت میں حلفیہ ارشاد ہوتا ہے کہ ضرور اُس دن وہ ان سے سوال کرے گا۔

برق صاحب کی خود ساختہ منطق کے رُو سے ہم کس آیت کو صحیح سمجھیں؟ (عیاذاً باللہ) مفسرین کرامؒ بیان فرماتے ہیں کہ پہلی آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ مجرموں سے مطلقاً کسی وقت بھی گفتگو نہ کرے گا بلکہ مراد یہ ہے کہ محبت شفقت اور پیار کے لہجہ میں جس طرح وہ مومنوں سے خطاب کرے گا مجرموں سے اُس کا اندازِ کلام اس طرح نہ ہوگا اُن سے خطاب کرتے وقت اس کی جلالی اور حاکمانہ شان خاص طور پر نمایاں ہوگی (دیکھئے ابن کثیر ج ۱ ص ۳۷۵، بیضاوی ج ۱ ص ۵۲۴ اور خازن ج ۱ ص ۵۲۵ وغیرہ) اگر دونوں آیتوں کی تطبیق کی یہ وجہ برق صاحب کے پسند ہے تو فبہا اور اگر ان کی تحقیق میں وجہِ تطبیق کوئی اور ہے تو وہی ہماری طرف سے ان دونوں حدیثوں میں (بلکہ تمام اُن احادیث میں جو بظاہر سطحی نگاہ میں آپس میں متعارض اور متضاد معلوم ہوتی ہیں) اختیار فرمالیں فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو خود ہی اپنے دام میں صیاد پھنس گیا

برق صاحب کا حدیث پر گیارہواں اعتراض

کردار رسول پہ ایک اور چوٹ، بخاری کی حدیث میں ہے عن عائشۃؓ قالت کنت اغتسل انا والنبی صلی اللہ علیہ وسلم من اناءٍ واحدٍ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک ہی برتن سے نہاتے تھے (بخاری ج ۱ ص ۳۹) اس حدیث کی تشریح مسلم نے یوں کی ہے:۔ کنت اغتسل انا والنبی صلی اللہ علیہ وسلّم من اناءٍ واحدٍ تختلف ایدینا فیہ من الجنابۃ مجامعت کے بعد میں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے اور اُس برتن میں (جس میں پانی بھرا ہوتا تھا) باری باری ہاتھ ڈالتے تھے (مسلم ج ۱ ص ۱۴۳) مطلب یہ کہ حضور ازواج کے ہمراہ برہنہ غسل فرمایا کرتے تھے دنیا میں کوئی عورت یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ وقت مباشرت کے علاوہ اس کا خاوند اُسے برہنہ دیکھ سکے پھر ہم سرورِ کائنات علیہ الف التحیات اور ان کی ازواج مطہرات کے متعلق یہ کیسے تسلیم کر لیں کہ وہ اکٹھے غسل فرمایا کرتے تھے میں مانتا ہوں کہ شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں لیکن ان احادیث کو پڑھ کر حضور کی جو تصویر دماغ میں تیار ہوتی ہے وہ برداشت نہیں کی جا سکتی ہم دشمنوں کو یہ کہنے کا کیوں موقع دیں کہ مسلمانوں کے پیغمبر اپنی نوعمر بیگم کے ساتھ برہنہ نہایا کرتے تھے (بلفظہٖ دو اسلام ص ۲۱۱ و ص ۲۱۲ طبع اوّل اور طبع ششم میں اس کو حذف کر دیا گیا ہے)۔

جواب:۔ یہ بات جانے دیجئے کہ برق صاحب کے دماغ نے حضرت اُم المومنینؓ کو بیگم کے لفظ سے تعبیر کرنا کیسے گوارا کر لیا ہے اور یہ بھی جانے دیجئے کہ نوعمر بیگم کے جملہ سے جو تصویر دماغ میں تیار ہوتی ہے اس کا کیا مفہوم نکلتا ہے؟ اور دشمن اس کے

کیا تاثر لے گا؟ اور کیا مجال ہے کہ اس تعبیر سے برق صاحب کا لائق اور حساس دماغ ذرہ برابر بھی جنبش میں آیا ہو؟ مگر ان باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے سوال صرف یہ ہے کہ اس پیش کردہ حدیث میں وہ کون سا لفظ موجود ہے جس کا معنیٰ اور ترجمہ برہنہ ہوتا ہے؟ پھر کیا یہ کھلی خیانت شقاوت قلبی اور بد دیانتی نہیں ہے کہ حدیث رسول میں اپنی طرف سے ایک نازیبا لفظ (برہنہ) اضافہ کر کے اور حدیث کا مضمون بدل کر اس پر اعتراض کیا جائے؟ سچ ہے ؎

بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن

کیا دو آدمیوں کا ایک مقام اور ایک جگہ میں غسل کرنا برہنگی کو مستلزم ہے؟ غسل کرنے اور بالکل برہنہ ہونے میں کون سا نقلی و عقلی اور عرفی تلازم ہے؟ کیا کپڑا باندھ کر غسل کرنا شرعاً اور عقلاً محال اور ممنوع ہے؟ برق صاحب کی عقل نے صحیح تصویر دماغ میں کیوں نہ تیار کر لی؟ جب کہ احادیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:-

ما رأیت فرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قط (شمائل ترمذی ص۲۶ و ابن ماجہ ص۴۸) کہ میں نے کبھی بھی جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شرمگاہ نہیں دیکھی اور برہنہ غسل کرنے میں رؤیت کی نفی نہیں ہو سکتی جیسا کہ ظاہر ہے اور اگر یہ کمزور سا محمل ہی متعین کر لیا جائے کہ یہ غسل رات کی تاریکی میں کیا ہو گا تو پھر بھی برق صاحب جس غرض کے لیے لفظ برہنہ اضافہ کرتے ہیں اس سے ان کو چنداں فائدہ نہیں ہو گا۔ لیکن کیا کیا جائے ان کو حدیث کا صحیح اور اچھا پہلو تو کبھی سوجتا ہی نہیں ؎

خزاں نہ تھی چمنستانِ دہر میں کوئی
خود اپنا ضعفِ نظر پردۂ بہار ہوا

الغرض نہ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام برہنہ تھے اور نہ حضرت عائشہؓ، یہ برہنگی

کا تصور برق صاحب کے آئینۂ دماغ کی میل ہے جو ان کو نظر آ رہی ہے ورنہ اُولٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ ۔ باقی برق صاحب کا یہ کہنا کہ میں مانتا ہوں کہ شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں تو یہ بھی ان کی جہالت یا غفلت پر مبنی ہے کیونکہ احادیث میں مجامعت اور قضائے حاجت کے بغیر حتّٰی کہ تنہائی میں بھی تستر اور پردہ کا حکم آیا ہے اور برہنگی کو پسند نہیں کیا گیا گو کبیرہ گناہ نہ سہی لیکن قبیح ناپسندیدہ اور مکروہ ضرور ہے پھر یہ کہنا کہ اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں یقیناً غلط ہے بغیر شرعی اجازت کے برہنگی بہرحال مذموم ہے ۔

برق صاحب کا حدیث پر بارھواں اعتراض

وضو کی ترکیب :۔ سوال یہ ہے کہ آیا وضو میں ہاتھ منہ اور پاؤں کو ایک مرتبہ دھونا چاہیئے یا زیادہ حدیث کا فیصلہ ملاحظہ ہو ۔

۱۔ حضور ایک مرتبہ دھوتے تھے ۔

عن ابن عباسؓ قال توضأ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم مرۃ مرۃ ۔ (بخاری کتاب الوضوء) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور وضوء میں اعضاء کو ایک ایک مرتبہ دھوتے تھے ۔

۲۔ دو دو مرتبہ دھوتے تھے ۔

عن عبد اللّٰہ بن زیدؓ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم توضأ مرتین مرتین (بخاری کتاب الوضوء) عبد اللہؓ بن زید کہتے ہیں کہ حضور وضوء میں اعضاء کو دو دو مرتبہ دھوتے تھے ۔

۳۔ تین تین مرتبہ دھوتے تھے ۔

حضرت عثمانؓ بن عفان فرماتے ہیں کہ حضور تین مرتبہ اعضاء کو دھوتے تھے اور جو شخص اس طرح وضوء کر کے دو رکعت نماز پڑھ لے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف

ہو جاتے ہیں (بخاری کتاب الوضوء ص۲۹) ایک حدیث اور لکھ کر آخر میں لکھتے ہیں کہ)۔
کچھ سمجھ میں آیا کہ حضور کس طرح وضو کیا کرتے تھے؟ چلو گناہ معاف کرنے کا نسخہ
تو ہاتھ آگیا۔ (انتہی بلفظہ دو اسلام ص۲۲۴ ص۲۲۵ طبع اول اور طبع ششم میں اس
کو خارج کر دیا گیا ہے)
جواب:۔ برق صاحب کو مناسب تھا کہ اس تحقیق انیق سے قبل عربی کے کسی مبتدی
طالب علم سے یہ پوچھ لیتے کہ توضأ ماضی مطلق ہے یا ماضی استمراری؟ اگر وہ یہ
بتلا دیتا کہ یہ ماضی استمراری کا صیغہ ہے تو اس کا معنی دھوتے تھے بجا تھا اور اگر وہ
یہ بتاتا کہ توضأ باب تفعل کی ماضی مطلق ہے اور صرف ایک مرتبہ فعل کرنے سے
ماضی مطلق کا مفہوم متحقق ہو جاتا ہے اور اس میں بار بار کرنے کا مفہوم شامل نہیں ہے
تو برق صاحب کو چاہیئے کہ وہ توضأ کا معنی یوں کرتے آپ نے وضو کیا (توضأ)
نہ یہ کہ آپ وضو کرتے تھے یا دھوتے تھے کیونکہ اس سے بار بار کرنے کا مفہوم
ادا ہوتا ہے جو ماضی استمراری کا مفاد ہے مثلاً اَكَلَ ماضی مطلق ہے اس کا معنی
ہے اس نے کھایا اُس کا یہ معنی کرنا کہ کھایا کرتا تھا یا کھاتا تھا باطل ہے کیونکہ یہ كَانَ
يَاكُلُ کا معنی ہے جو ماضی استمراری ہے۔
(نوٹ) كَانَ کا فعل مضارع پر داخل ہو کر ہمیشہ استمرار کا فائدہ دینا قاعدہ
کلیہ نہیں ہے دیکھئے نووی شرح مسلم وغیرہ۔ برق صاحب کے رمز شناس دماغ کا کرشمہ
دیکھئے کہ معنی کرتے وقت خیانت یا جہالت کا ثبوت دیا ہے اور اس پر یہ علمی
اور تحقیقی نتیجہ مرتب کیا ہے کہ کچھ سمجھ میں آیا کہ حضور کس طرح وضو کیا کرتے تھے۔"
اور یہ خیال نہ کیا کہ شاید غلطی اپنے نارسا دماغ کی ہو ع

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت رسالت اُمت

کو دیگر امور کی طرح وضو کرنے کا عملی سبق بھی مختلف اوقات میں دیا ہے کسی موقع پر آپ نے صرف ایک ایک مرتبہ اعضاء دھو کر وضو کا طریقہ بتلایا تاکہ اگر کہیں زیادہ پانی میسر نہ ہو سکے یا بیماری وغیرہ کسی اور شرعی عذر کی وجہ سے ایک سے زیادہ مرتبہ اعضاء کا دھونا مشکل ہو تو ایسی صورت میں ایک ہی مرتبہ اعضاء دھونے سے وضو مکمل ہو جائے گا اور یہ قدر وضو میں فرض ہے جو نفس جوانہ کا درجہ ہے اور کسی موقع پر آپ نے دو دو مرتبہ وضو کر کے فرمایا کہ یہ نور علی نور اور بین بین و متوسط درجہ ہے جس سے طہارت اور نظافت بخوبی حاصل ہو سکتی ہے اور اکثر مواقع پر آپ نے تین تین مرتبہ وضو کر کے سب سے اعلیٰ اور اکمل طریقہ بتلا دیا تاکہ اس میں فرض سُنت اور مستحب وغیرہ سبھی امور آجائیں اور یہ تکمیل اور محبوبیت کا انتہائی درجہ ہے اس کے بعد مزید پانی استعمال کرنا اسراف اور تعدی میں شامل ہے جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے اتنی سی بات تھی جو برق صاحب پر معمہ بن گئی اور الٹا حدیث پر اعتراض شروع کر دیا۔ اور آپ پہلے یہ پڑھ چکے ہیں کہ وضو وغیرہ سے صرف صغائر معاف ہوتے ہیں نہ کہ کبائر۔ اس کے باوجود بھی اگر برق صاحب اسکو تمام گناہ معاف کرانے کا نسخہ تصور فرماتے ہیں اور طنز سے باز نہیں آتے تو تعدیل مزاج کی سعی فرمائیں۔ کیونکہ سرکار برطانیہ کی طرف سے ان کو ڈاکٹری کی جو ڈگری ملی ہے اس نے ان کے دماغ کا توازن بگاڑ دیا ہے سچ ہے کہ ؎

پھونکا وہ فسوں ساحر انگلش نے انور
تہذیب میں داخل ہوا اسلام کا انکار

برق صاحب کا حدیث پر تیرسواں اعتراض

لکھتے ہیں کہ چند اور احادیث ملاحظہ ہوں۔

مَن قَبَّلَ امرأتہ او جَسَّھَا بیدہٖ فعلیہ الوضوء (موطا ص ۳۳) جو شخص

اپنی بیوی کو چوم لے یا چھُولے اس پر وضوء لازم ہے

لیکن اسی صفحہ پہ یہ حدیث بھی موجود ہے :۔

عن عائشۃؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبل بعض نسائہٖ ثم خرج الی الصلوٰۃ ولم یتوضأ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج میں سے کسی کے بوسے لیے اور پھر وضوء کیے بغیر نماز ادا فرمائی :۔

حضور کا حکم وہ اور عمل یہ کس کی اقتدا کریں (انتہیٰ بلفظہٖ دو اسلام ص۱۶۳ طبع اوّل ونحوہ فی طبع ششم ص۱۷۶)

جواب :۔ برق صاحب نے اپنی فطرت اور عادت کے مطابق یہاں بھی خیانت یا جہالت سے کام لیا ہے اصل روایت یوں ہے :۔

عن ابن عمرؓ انہ کان یقول قُبلۃ الرجل امرأتہ وجَسُّھا بیدہٖ من الملامسۃ ومن قبل امرأتہ وجسھا بیدہٖ فعلیہ الوضوء (رواہ مالکؒ ص۲۳ والشافعیؒ مشکوٰۃ ج ۱ ص۴۱) حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ اپنی طرف سے یہ کہا کرتے تھے کہ جب کوئی آدمی اپنی بیوی کا بوسہ لے اور اس کو ہاتھ سے چھُولے تو اس کا وضوء ٹوٹ جاتا ہے کیونکہ یہ صورت (ابن عمرؓ کی تحقیق میں) ملامسۃ ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کا یہ فتویٰ اور اجتہاد صحیح ہے یا غلط ؟ ائمہ دین کا یہ اتفاقی مسئلہ ہے یا اختلافی ؟ اور ہر ایک فریق کے پاس کون سی دلیل ہے ؟ یہ سب امور ہمارے موضوعِ کلام سے خارج ہیں ہمیں تو یہ بتلانا ہے کہ برق صاحب نے خیانت یا جہالت سے ابنِ عمرؓ کا یہ فتویٰ اور قول ، جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قول اور حکم قرار دیا ہے اور عبارت کا پہلا حصہ جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے اس کو بالکل حذف کر دیا ہے اور حضرت ابنِ عمرؓ کے اس قول کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم قرار دے کر آپ کے فعل سے (جو دوسری حدیث

میں بیان کیا گیا ہے) تعارض قائم کیا ہے اور یہ مجتہدانہ رنگ میں یوں گوہر افشانی کی ہے کہ حضور کا حکم وہ اور عمل یہ کس کی اقتدا کریں؟ یہ ہے برق صاحب کی قابلیت اور دیانت جس کے بل بوتے پر وہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی غلطیاں نکالتے ہیں۔ لیکن ان کو اس سے کیا غرض کہ دیانت ہے یا نہ ہے ہاں البتہ انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور اس پر صرف کر دیا ہے کہ کہیں حدیث ثابت ہو گئی تو پابندی کی زندگی بسر کرنا پڑے گی، صورت، سیرت، اخلاق، عادات اور معاملات غرضیکہ ہر چیز میں پابند اسلام اور پیرو شریعت ہونا پڑے گا۔ اتنی سی غرض ہے جس نے برق صاحب کو مضطرب اور بے تاب کر رکھا ہے جیسا کہ ان کی تمام کتابیں جہان نو، دو قرآن، دو اسلام اور ایک اسلام اس غرض کو نمایاں طور پر واضح کرتی ہیں جیسا کہ ہم نے مقدمہ میں ان کے بعض اقتباسات بھی درج کئے ہیں ملاحظہ کر لیں اور اب خدا معلوم وہ تین اسلام لکھنے کے درپے ہیں یا نصف اسلام، تین قرآن تحریر فرما رہے ہیں یا نیا قرآن بہرحال کوئی نہ کوئی خدمت تو وہ ضرور انجام دے رہے ہوں گے باقی رہی دیانۃ حدیث کی تحقیق تو محدثین جانیں اور حدیثیں برق صاحب کو اس سے کیا علاقہ اور غرض؟ ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

برق صاحب کا حدیث پر چودھواں اعتراض

(وہ لکھتے ہیں کہ) کیا حائضہ نماز ادا کرے؟ فقہ کا مسئلہ تو یہی ہے کہ حائضہ روزے رکھے اور نماز نہ پڑھے ان الحائض "تقضی الصیام" ولا تقضی الصلوٰۃ حائضہ روزے رکھے اور نماز ادا نہ کرے (بخاری ج ۱ ص ۲۲۹) لیکن حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضور کی ایک زوجہ حضور کے ساتھ معتکف ہو گئیں اس دوران میں انہیں حیض شروع ہو گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ جب وہ نماز پڑھتی تھیں تو ہم ان

کے نیچے برتن رکھ دیتے تھے (تاکہ خون مسجد میں نہ گرنے پائے) (بخاری ج ۱ ص ۲۳۷) انتہیٰ بلفظہ
دو اسلام ص ۲۴۱ و ص ۲۴۲ طبع اول اور اب طبع ششم میں یہ عبارت اڑا دی گئی ہے)۔
ایک دوسرے مقام پر طنز کے طور پر لکھتے ہیں کہ حائضہ کے لیے نماز ممنوع۔ اگر پڑھنا چاہے
تو نیچے ایک طشتری رکھ لے (دو اسلام ص ۲۵۱ طبع اول اب یہ عبارت حذف کر دی گئی ہے)
جواب :۔ برق صاحب سے اس موقع پر تین خیانتیں یا جہالتیں سرزد ہوئی ہیں اول یہ
کہ وہ لکھتے ہیں کہ فقہ کا مسئلہ تو یہی ہے کہ حائضہ روزے رکھے۔ نہ معلوم یہ کس امام کی
فقہ میں لکھا ہے کیونکہ حضرت امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ
وغیرہ فقیہ اماموں کی فقہ میں تو صاف طور پر یہ حکم لکھا ہے کہ حائضہ عورت حیض کی حالت
میں روزہ ہرگز نہیں رکھ سکتی مگر برق صاحب حصر کر کے لکھتے ہیں کہ فقہ کا مسئلہ تو
یہی ہے کہ حائضہ روزے رکھے شاید اس فقہ سے برق صاحب کی مراد خود اپنی ایجاد
کردہ کوئی فقہ ہوگی یا کسی ایسے امام کی ایجاد کردہ ہوگی جو امام تو قرآن کے مدمقابل کوئی نیا
امام عالم وجود میں آیا ہوگا اور اس نے کوئی جدا فقہ لکھی ہوگی دوم یہ کہ تقضی الصیام
کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ حائضہ روزے رکھے۔ یہ بھی برق صاحب کی خیانت یا جہالت
ہے اس کا صحیح معنیٰ یہ ہے کہ حائضہ روزوں کی قضا کرے۔ نہ یہ کہ حیض کی حالت
میں روزے رکھے اصل بات یہ ہے کہ حیض ایک لازمی بیماری ہے جس سے ہر
جوان اور غیر معذور عورت کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور حیض ماہ میں زیادہ سے زیادہ
دس ایام ہوتا ہے رمضان چونکہ سال میں صرف ایک مرتبہ آتا ہے اس لیے پورے
سال میں صرف دس روزے قضا کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے بخلاف نماز کے
کہ وہ دن رات میں پانچ مرتبہ ادا کرنا پڑتی ہے تو اگر ہر مہینہ میں دس دن کی اور ہر دن
رات کی پانچ نمازیں حائضہ کو قضا کرنا پڑیں تو اس کے لیے یقیناً دقت اور مصیبت
ہوگی اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت نے بمقتضائے وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ

مِنْ حَرَجٍ) کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی حرج اور تنگی نہیں کی حائضہ کے لیے یہ آسانی کر دی کہ نمازیں قضا نہ کرے کیونکہ اس میں حرج واقع ہوگا اور روزے قضا کرے کیونکہ سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دس روزے قضا کر لینے چنداں مشکل نہیں ہیں، یہ تھی صحیح بات لیکن برقؔ صاحب کا اجتہاد اس کو کسی اور ہی طرف لے گیا ہے اور حدیث کے صحیح معنیٰ کو اپنے دماغ کی ٹیڑھی ساخت کی وجہ سے بدل دیا ہے

سوم یہ کہ برقؔ صاحب کی جسارت یا غفلت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی زوجہ مطہرہ کے استحاضہ کو حیض بنا دیا ہے حالانکہ صحیح بخاری صـ۴۵ کی اسی روایت میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یہ حیض نہ تھا بلکہ استحاضہ[لہ] کی بیماری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حیض کے دن اور عادت پوری ہو چکنے کے بعد جو خون عورت کو نظر آتا ہے وہ استحاضہ کہلاتا ہے اور استحاضہ کی حالت میں نماز، روزہ، جماع، طواف اور مسجد میں داخل ہونا وغیرہ تمام امور جائز اور صحیح ہیں اور حیض کی حالت میں ان امور میں سے کوئی امر بھی جائز اور درست نہیں ہے۔ اگر کسی آدمی کو سلسل بول، بواسیر نکسیر اور خروج ریح کی بیماری ہو یا بدن سے خون نکلتا ہو اور ان عوارض سے خالی ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا یا کوئی عورت استحاضہ کا شکار ہو جائے تو ان میں ہر ایک کو یہ حکم ہے کہ ہر وقتِ صلوٰۃ کے لیے وضو کر کے نماز ادا کرتے رہیں ان عوارض سے

لہ ممکن ہے کہ برقؔ صاحب کے نزدیک یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح (جو ان کے نزدیک اصلی مسلمان ہیں) استحاضہ اور حیض ایک ہی ہو۔ چنانچہ برقؔ صاحب کی غیر محرف کتاب مقدس میں لکھا ہے کہ اگر کسی عورت کے ایام حیض کو چھوڑ کر دیں بہت دنوں تک خون آئے یا حیض کی عدت گذر جانے پر بھی خون جاری ہے تو جب تک اس کو یہ میلا خون آتا رہے گا تب تک وہ ایسی ہی رہے گی جیسی حیض کے دنوں میں رہتی ہے وہ ناپاک ہے۔ (احبار باب ۱۵ آیت ۲۵)

ان کا وضو نہیں ٹوٹے گا (جیسا کہ اس حدیث میں زوجہ مطہرہ نے ایسا ہی کیا تھا) اگرچہ حالت اس حد تک پہنچ جائے کہ خون کے قطرے بھی زمین پر گرتے رہیں مگر نماز نہ چھوڑیں جو چیز ان کے بس کی ہے اس کو کرتے جائیں اور جس میں ان کے بس کا دخل نہیں اس میں ان کو گرفت نہ ہوگی لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا (الآیۃ) برق صاحب ہی خدارا فرمائیں کہ ان کو اس میں کیا اعتراض ہے؟ اگر اس تصریح کے بعد بھی برق صاحب کو یہ بات سمجھ نہیں آتی تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ؎

گہر جو دل میں نہاں ہیں خدا ہی دے توفیق
اسی کے پاس ہے مفتاح اس خزانے کی

برق صاحب کا حدیث پر پندرھواں اعتراض

کیا نمازی کے سامنے سے گذرنا ممنوع ہے؟ فقہا کے ہاں دوران نماز میں نمازی کے سامنے سے گذرنا ممنوع ہے۔ بخاری میں ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ اگر کوئی شخص کسی نمازی کے سامنے سے گذر رہا ہو تو اسے روکو اگر نہ رکے فلیقاتلہ فانما ھو شیطان تو اس سے باقاعدہ تلوار سے جنگ کرو اس لیے کہ وہ شیطان ہے (بخاری ج۱ صـ۶۸) لیکن ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں گدھی پر سوار ہو کر منیٰ میں پہنچا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے میں کچھ نمازیوں کے سامنے سے گذر کر گدھی سے اترا گدھی کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا خود نماز میں شامل ہو گیا اور کسی نے برا نہ مانا (بخاری ج۱ صـ۱۰۱) اسی طرح ایک روایت مؤطا میں بھی ہے۔ ان سعدؓ بن ابی وقاص کان یمر بین یدی بعض الصفوف والصلوٰۃ قائمۃ کہ نماز کے دوران میں سعدؓ بن ابی وقاص نمازیوں کی صفوں کے سامنے سے گذرا جاتے تھے (موطا صـ۵۵) (انتہی بلفظہٖ دو اسلام صـ۲۳۹ طبع اوّل اور صـ۲۴۶ طبع ششم مگر اس میں تلوار کا لفظ حذف کر دیا ہے صرف باقاعدہ جنگ کر دپہ اکتفا کی گئی ہے)

پھر چند اوراق کے بعد طنزیہ طور پر مجتہدانہ فیصلہ صادر فرماتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں کہ اگر کوئی شخص نمازی کے سامنے سے گذر رہا ہو تو اُسے مار ڈالو ہاں اگر حضرت ابن عباسؓ یا سعدؓ بن ابی وقاص ہوں تو چھوڑ دو (انتہٰی بلفظہٖ دو اسلام ص ۲۵۱ طبع اوّل و ص ۲۵۵ طبع ششم)

جواب:۔ برقؔ صاحب پر از روئے انصاف و دیانت یہ لازم تھا کہ فقہا کرامؒ کی عبارات میں نمازی کے سامنے گذرنے کی ممانعت کی جملہ قیود اور شروط بھی ملاحظہ فرما لیتے کہ کہاں سامنے سے گذرنا جائز اور کہاں ناجائز ہے احادیث میں اور فقہاء کرامؒ کی عبارات میں اس کی صراحت مذکور ہے کہ منفرد کے آگے اگر سُترہ ہو تو اُس کے آگے سے گذرنا جائز ہے اسی طرح اگر امام کے سامنے سُترہ ہو تو اُس کے آگے سے گذرنا جائز ہے ہاں البتہ سُترہ اور نمازی کے درمیان سے گذرنا جائز نہیں ہے اور امام کا سُترہ سب مقتدیوں کو کافی اور وافی ہے ۔ منٰی چونکہ کھلا میدان تھا اس لیے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت سعدؓ کا بعض صفوف کے اطراف میں اِدھر اُدھر نمازیوں کے آگے دور دور سے گذر جانا اصولی شکی نہیں ہے اس لیے کہ امام کا سُترہ سب مقتدیوں کے لیے کافی ہوتا ہے ۔ برقؔ صاحب کا یہ کمال بھی دیکھیے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں یہ جملہ بھی ہے وانا یومئذ قد ناهزت الاحتلام (حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اُس وقت قریب البلوغ اور درحقیقت نابالغ تھا) نہ معلوم برقؔ صاحب نے کس مصلحت کے پیش نظر یہ جملہ حذف کر دیا ہے؟ اور برقؔ صاحب کی یہ ستم ظریفی بھی ملاحظہ کیجیے کہ وہ فلیقاتل کا معنی ایک مقام پر یہ کرتے ہیں کہ اُس سے باقاعدہ تلوار لے کر جنگ کرو اور دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ اُسے مار ڈالو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ برقؔ صاحب کا خاص اجتہاد ہے یا ان کو قتل اور قتال کے معنیٰ میں فرق معلوم نہیں ہے قتل کا معنیٰ

جان سے مار ڈالنے کے آتے ہیں اور قتال کا معنیٰ ہے جنگ، کارزار، جھگڑا فساد لڑائی تکرار، ہاتھ سے دھکہ دینا، مدافعت کرنا سخت الفاظ سے کسی کو کوسنا وغیرہ (دیکھیے فیروز اللغات وغیرہ کتب لغت) برق صاحب یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ نمازی اپنے سامنے سے گذرنے والے کے لیے گھر سے یا اسلحہ جات کی دوکان سے تیر و تفنگ اور بندوق و تلوار لے کر آئے اور اس کو جان ہی سے مار ڈالے حالانکہ قتال کے مفہوم میں تلوار لے کر جنگ کرنا قطعاً ضروری نہیں ہے اور مار ڈالنا تو اس کا کسی طرح بھی معنیٰ نہیں ہو سکتا۔ حضرت امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:۔

واجمعوا علی انه لا یلزمه مقاتلته بالسلاح ولا مایؤدی الی هلاکه الخ

(شرح مسلم ج ۱ ص ۱۹۶) تمام محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ نہ تو نمازی پر ہتھیار لے کر جنگ کرنا لازم ہے اور نہ اس کو مار ڈالنا۔

الغرض نماز میں تسبیح و اشارہ سے یا کوئی کلمہ جہر کے ساتھ پڑھنے سے سامنے سے گذرنے والے کو آگاہ کرنے کے لیے کافی ہے جیسا کہ فادرأوا ما استطعتم (حسب قدرت اس کو سامنے سے ہٹانے کی کوشش کرو) حدیث میں وارد ہے مگر برق صاحب خواہ مخواہ کج بحثی پر تلے ہوئے ہیں سچ ہے کہ اگر کوئی آدمی احول اور بھینگا ہو اور اس کی آنکھ کی ساخت ٹیڑھی ہو تو ہر چیز بجائے ایک کے اس کو دو نظر آئیں گی۔ یہی حال برق صاحب کا ہے ان کو بجائے ایک اسلام کے دو اسلام اور ایک قرآن کے دو قرآن نظر آتے ہیں ؎

رہے نہ اہلِ بصیرت تو بے خبر چمکے
فروغ نفس ہوا عقل کے زوال کے بعد

برق صاحب کا حدیث پر سولہواں اعتراض

تعداد رکعات۔ ہم ظہر، عصر، اور عشار کی نماز میں چار چار رکعات پڑھتے ہیں لیکن مؤطا (کتاب الصلوٰۃ صہ ۴۲) میں درج ہے۔ ان عمرؓ بن الخطاب کان یقول صلوٰۃ اللیل والنہار مثنیٰ مثنیٰ۔ عمرؓ بن الخطاب فرمایا کرتے تھے کہ رات اور دن کی نماز صرف دو دو رکعت ہے بخاری میں مذکور ہے عن ابی جحیفۃؓ قال خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالہاجرۃ فاتی بوضوء فتوضأ وصلی النبی صلی اللہ علیہ وسلم الظہر رکعتین والعصر رکعتین :۔ ابو جحیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک دن دوپہر کے وقت حضور باہر تشریف لائے پانی منگوایا وضو کیا۔ اور پھر صلوٰۃ ظہر و عصر کی دو دو رکعتیں پڑھیں اس حدیث میں قطعاً یہ مذکور نہیں کہ آپ سفر پر تھے اور اس لیے نماز میں تخفیف کر لی تھی۔ (انتہیٰ بلفظہ دو اسلام صہ ۲۳۵ و صہ ۲۳۶ طبع اوّل اور اب اس کو حذف کر دیا گیا ہے)

جواب:۔ مؤلف کو صرف حضرت عمرؓ کا یہ قول دستیاب ہوا ہے اور اس پر وہ اتنے ناراض اور تنگ دل معلوم ہوتے ہیں اگر ان کو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد صلاۃ اللیل مثنیٰ مثنیٰ (الحدیث متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ صہ ۱۱۱ کہ رات کی نماز دو رکعت ہے) مل جاتا تو نہ معلوم ان پر کیا گذرتی؟

بات صرف یہ ہے کہ برق صاحب اس بات پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں کہ اصل بات نہ سمجھنی ہے اور نہ کسی کو سمجھنے دینی ہے وہ سب حدیثیں جن میں انہوں نے شبہات پیدا کئے ہیں ایسی ہرگز نہ تھیں کہ طائرانہ نگاہ ڈالتے ہی سمجھ نہ آجاتیں۔ حضرت عمرؓ کا اثر اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث محض نوافل، سنن غیر مؤکدہ اور تہجد کی نماز کے بارے میں ہے کہ اگر دن کو نفل نماز پڑھی جائے یا رات کو تو بہتر یہ ہے کہ دو دو رکعت ہونی چاہیئے

تاکہ ہر دو رکعت کے بعد تشہد درود دعا اور سلام کی فضیلت حاصل ہوتی ہے اس اثر اور حدیث کا تعلق فرائض اور سنن مؤکدہ کے ساتھ ہرگز نہیں جیسا کہ مؤلف کو غلط فہمی ہوئی ہے یا عمداً خیانت فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ محدثین کرامؒ کی ارواح کو خوش و خرم رکھے اور ان کی قبروں کو روشن کرے کہ انہوں نے ہر حدیث کو اپنے اپنے باب میں لکھ کر امت کو غلط فہمیوں اور پیچیدگیوں سے محفوظ کر دیا ہے چنانچہ یہ اثر اور روایت بھی باب صلاۃ اللیل، یا باب قیام اللیل وغیرہ میں لکھ کر یہ حقیقت آشکارا کر دی ہے اور یہ روایت بھی حضرت امام مالکؒ نے باب ماجاء فی صلوٰۃ اللیل میں نقل کر کے یہ حقیقت واضح کر دی ہے اب ہمارے ذمہ حضرت ابو جحیفہؓ کی روایت کا جواب باقی رہ جاتا ہے سو وہ بھی سُن لیجیے کہ ان کی وہ تفصیلی روایت کیا بتلاتی ہے حضرت ابو جحیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول خدا صلی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ مکرمہ کے قریب ابطح (اس مقام کو محصب بھی کہتے ہیں) کے مقام میں چمڑے کے سرخ رنگ کے خیمہ میں فروکش پایا۔ حضرت بلالؓ حضور کے وضوء سے بچے ہوئے پانی دیا جس پانی سے وضوء کیا گیا تھا) کو لیے کھڑے تھے اور لوگ جوق در جوق آکر اُس پانی کو لے کر اپنے بدن پر ملتے تھے جس کو حضرت بلالؓ سے براہِ راست پانی نہ مل سکتا وہ دوسرے رفیق کے ہاتھوں سے اُس متبرک پانی کے قطرات لے کر عشق اور عقیدت کی آتش کو بجھاتا تھا پھر میں نے دیکھا کہ حضرت بلالؓ نے عنزہ (لاٹھی جس کے کنارے پر لوہا چڑھا ہوا تھا) کو سامنے گاڑ دیا اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیزی کے ساتھ اپنے سرخ رنگ کے خیمہ سے نکلے اور لوگوں کو آپ نے دو رکعت نماز پڑھائی میں نے دیکھا کہ لوگ اور جانور عنزہ کے اُس پار سے گذر رہے تھے (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۷۲) امام نوویؒ لکھتے ہیں کہ یہ روایت قصر الصلوٰۃ فی السفر سے متعلق ہے (شرح مسلم ج ۱ ص ۱۹۶،

اور حافظ قسطلانیؒ لکھتے ہیں قصر للسفر (قسطلانی ج ا ص۲۲۰) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نماز سفر کی وجہ سے دو رکعتیں پڑھی تھیں۔

برق صاحب ہی انصاف سے فرماویں کہ کیا مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ کی (تقریباً تین سو گیارہ میل کی) مسافت سفر کہلائے گی یا نہیں؟ اگر سفر ہے اور یقیناً ہے تو کیا اپنے الفاظ پر (کہ اس حدیث میں قطعاً یہ مذکور نہیں کہ آپ سفر پر تھے اور اس لیے نماز میں تخفیف کر لی تھی) نظر ثانی کریں گے؟ یا نظر ثانی کرنے اور حضور کی حدیث کے اقرار کر لینے سے اپنی شان کی تحقیر سمجھیں گے؟ قارئین کرام آپ نے برق صاحب کی تحقیق کا اندازہ کر ہی لیا ہے۔ اب برق صاحب نے اپنی خیانت اور غلطی محسوس کر لی ہے اور اس کو اڑا دیا ہے۔

برق صاحب کا حدیث پر سترھواں اعتراض

ہمیں نماز میں رکوع و سجود و قیام و قعود کے بغیر کسی اور عمل کی اجازت نہیں لیکن بخاری میں ہے سہلؓ بن سعد کہتے ہیں کہ جب مسجد نبوی کے لیے منبر تیار ہوا تو حضور اس پر چڑھ گئے منہ قبلہ کی طرف پھیر لیا تکبیر کہی لوگوں نے پیچھے صفیں باندھ لیں قرآت کے بعد رکوع میں گئے رکوع کے بعد نیچے اتر آئے زمین پر سجدہ کیا اور پھر منبر پر چڑھ گئے اور رکوع کے بعد پھر سجدے کے لیے زمین پر اتر آئے (بخاری ج ا ص۵۴) انتہی بلفظہٖ دو اسلام ص۲۳۸ طبع اوّل و ص۲۴۵ طبع ششم)۔

جواب: کتب حدیث اور فقہ میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ تکبیر تحریمہ کہتے وقت دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھانے چاہئیں اور یہ ایک عمل ہے۔ رکوع کے بعد قومہ کرنا چاہیئے اور یہ ایک عمل ہے۔ سجدے کے بعد جلسہ کرنا چاہیئے۔ اگر صف میں فرجہ اور خلا ہو تو اس کو فوراً پُر کرنا چاہیئے قرآت کرنے کا حکم ہے جو زبان کا عمل ہے، سانپ اور بچھو بالکل قریب اور سامنے آجائے تو اس کو قتل کر دینا چاہیئے

اور اختتامِ نماز کے وقت دونوں طرف منہ پھیر کر سلام کہنا چاہیئے وغیرہ وغیرہ اور یہ سب از قسم اعمال ہیں اور نہ صرف ان کے کرنے کی اجازت دی گئی ہے بلکہ ان اعمال میں سے بعض کو وجوب اور بعض کو سنیت کا درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن برق صاحب کی خانہ ساز فقہ کہتی ہے کہ ہمیں نماز میں رکوع و سجود و قیام و قعود کے بغیر کسی اور عمل کی اجازت نہیں۔ نہ معلوم یہ فقہ انہوں نے کس سے سیکھی اور حاصل کی ہے؟ یا اپنے اجتہاد کے زور میں ایسا لکھ بیٹھے ہیں؟ اور جو روایت انہوں نے بخاری کے حوالہ سے نقل کی ہے اگر وہ خیانت نہ کرتے اور پوری روایت نقل کرتے تو پڑھنے والے حضرات خود بخود ایک ایسا نظریہ قائم کر لیتے جو ان کو شبہات اور اوہام میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھتا۔ بخاری وغیرہ کی اس حدیث کے آخر میں یہ ارشاد مذکور ہے فلما فرغ اقبل علی الناس فقال یایھا الناس انما صنعت ھذا لتاتموا بی و لتعلّموا صلوتی متفق علیہ (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۹۹) جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو میں نے یہ کام اس لیے کیا ہے تاکہ تم میری ہر ہر ادا کو اچھی طرح دیکھ کر میری اقتدا کرو اور تاکہ تم میری نماز کو خوب اچھی طرح جان لو۔

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر چڑھ کر صحابہ کرامؓ کو نماز پڑھنے کا عملی نمونہ بتایا اور نماز کے ہر ہر رکن کی ٹریننگ دی ہے تو اس میں برق صاحب کو کیا اعتراض ہے؟ کیا جناب رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ نماز جیسی اہم عبادت کا عملی نقشہ کھینچ کر بتلائیں تاکہ کسی کو شک و شبہ باقی نہ رہے؟ کیسی سیدھی سادھی بات تھی مگر برق صاحب کے اجتہاد کا کرشمہ دیکھئے کہ اسے کیا سے کیا کر دکھایا ہے۔ شاید وہ یہ کہہ کر اس سے بھی عہدہ برآ ہو جائیں کہ ؎

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے صحؔ نئی بات کیا آپ سمجھا رہے ہیں

برق صاحب کا حدیث پر اٹھارواں اعتراض

اِس سلسلے کی ایک اور حدیث سنیئے :۔

حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ حج کے لیے روانہ ہوئے جن کے پاس قربانی کے لیے کچھ بھی نہیں تھا انہیں ذوالحجہ کی پانچویں تاریخ کو احرام توڑنے کی اجازت دے دی گئی چنانچہ ہم نے خوب جماع کیا اور پانچویں دن کے بعد جب ہم عرفہ کے لیے روانہ ہوئے تو (تقطر مذاکیرنا المنی) ہمارے اعضائے تناسل سے نطفہ بدستور ٹپک رہا تھا (مسلم ج ۳ ص ۲۷۳) یہ کس قسم کے آلات تناسل تھے کہ پانچ دن تک جماع بھی کرتے رہے اور جب چھٹے دن عرفہ کے لیے نکلے تو اس وقت بھی نطفہ بدستور ٹپک رہا تھا عام حالات میں جماع کے بعد تسکین آجاتی ہے لیکن خدا جانے ان صحابہؓ نے کون سا کُشتہ کھایا ہوا تھا کہ حج کے مقدس موقعہ پر بھی اُن کا نطفہ اُچھل اُچھل کر زمین پر گر رہا تھا بالکل خلاف عقل اور خلاف حقیقت الخ (دو اسلام ص ۲۲۵ بلفظہ طبع اوّل اور اب اس کو بالکل پی گئے ہیں)

جواب :۔ برق صاحب نے اس موقع پر بھی خیانت یا جہالت کا بین ثبوت دیا ہے اور اصل بات کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں فرمائی ورنہ وہ کبھی ایسی کھلی غلطی اور خلاف حقیقت بات کا ہرگز ارتکاب نہ کرتے اصل حدیث جن الفاظ سے مروی ہے۔ ان میں سے وہ الفاظ جن کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے یہ ہیں غور فرمائیے :

قال جابرؓ اهللنا اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم بالحج خالصاً وحده فقدم النبي صلى الله عليه وسلم صبح رابعة مضت من ذي الحجة فامرنا ان نحل قال حلوا واصيبوا النساء قال عطاء ولم يعزم عليهم ولكن احلهن لهم فقلنا لما لم يكن بيننا وبين عرفة الا خمس امرنا ان نُفضي الى نسائنا فنأتي عرفة تقطر مذاكيرنا المني

قال فقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم فینا فقال قد علمتم انی اتقاکم للہ واصدقکم و ابرکم ولولا ھدی لحللت کما تحلون ولو استقبلت من امری ما استدبرت لم اسق الھدی تحلوا فحللنا وسمعنا واطعنا (مسلم ج ۱ ص ۳۹۲ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۶) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے یعنی صحابہ کرامؓ نے خالص حج کا احرام باندھا تھا ذوالحجہ کی چوتھی تاریخ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ہمیں حکم دیا کہ ہم احرام کھول دیں اور فرمایا کہ تم احرام کھول کر اپنی بیویوں سے ہمبستری کرو عطاؒ کہتے ہیں کہ یہ حکم وجوبی نہ تھا صرف اجازت دی گئی تھی۔ ہم نے کہا جب کہ ہم میں اور عرفہ (ذوالحجہ کی نویں تاریخ جس میں حاجی لوگ میدان عرفات میں جمع ہوتے ہیں) میں صرف پانچ راتیں باقی ہیں اب حضور ہمیں یہ حکم ارشاد فرمارہے ہیں کہ ہم عورتوں سے ہمبستری کریں اور جب عرفہ کو جائیں گے تو ہم بیویوں سے خوب لطف اندوز ہو چکے ہوں گے؟ (ہم نے اس حکم کے ماننے میں تامل کیا) حضور نے کھڑے ہو کر ہم سے خطاب فرمایا تم خوب جانتے ہو کہ میں تم سب سے زیادہ عنداللہ متقی، سچا اور نیک ہوں اور اگر میرے پاس قربانی کے جانور نہ ہوتے اور مجھے پہلے سے وہ بات معلوم ہو جاتی جو اب معلوم ہوئی ہے تو میں قربانی کے جانور ساتھ نہ لاتا سو تم احرام کھول لو (حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ) ہم نے احرام کھول کر آپ کا حکم سُنا اور اطاعت کی۔

چونکہ صحابہ کرامؓ نے اپنی تمام خواہشات اور نفس پر قابو پاکر تمام لذائذ اور مرغوبات کو خالص حج کا احرام باندھ کر ترک کر دیا تھا اور بعض کے پاس قربانی کے جانور نہ تھے آپ نے بعد کو یہ حکم پاکر صحابہ کرامؓ کو ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس قربانی کا جانور نہیں وہ حج کا احرام کھول لے اور بیوی سے ہمبستری کرے اور صرف عمرہ ادا کرے اور اس کے بعد حج کے لیے نیا احرام باندھے اور حج سے فارغ ہو جائے تو ایک سفر میں دو

عبادتوں (عمرہ اور حج جو الگ الگ احرام سے کئے گئے ہوں اور اس فعل کو تمتع کہتے ہیں) کے جمع کرنے کی خوشی میں قربانی کرے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو تین دن روزے حج کے ایام میں اور سات دن فراغت حج کے بعد ادا کرے۔ لیکن چونکہ درمیان میں وقفہ بہت تھوڑا تھا (یعنی پانچ راتیں) اس لیے صحابہؓ نے اس حکم کے تسلیم کرنے میں ذرا تامل کیا اور اس کی وجہ بھی صرف یہی بتلائی کہ ہم نے احرام باندھ کر تمام لذائذ نفسانیہ سے علیحدہ رہنے کا عہد اتمام حج تک کیا ہوا ہے بالخصوص شہوانی امور جو عبادت کے شان کے بالکل منافی ہیں۔ اب ہم احرام کھول کر عبادت کا نقصان کس طرح کریں بالخصوص جب کہ بہت قلیل وقفہ درمیان میں باقی ہے اس میں ہم اپنی بیویوں سے لطف اندوز ہو کر کیسے میدان عرفہ میں جائیں گے؟ اس حدیث میں تقطر مذاکیرنا المنی جماع ہمبستری اور بیوی سے لطف اندوز ہونے سے کنایہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں دخلتم بہن اسی سے کنایہ ہے اور عربی کے معمولی طالب علم سے بھی یہ مخفی نہیں ہے چنانچہ آپ کے ارشاد کے بعد صحابہ کرامؓ نے آپ کے بتلائے ہوئے طریقہ پر احرام کھولا اور جب احرام کھولنے کی شرط پوری ہوگئی تو پھر حج کا احرام باندھ کر حج کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے جب ۴ ذوالحجہ کو حکم تسلیم کرنے میں کچھ تامل کیا تو اس خیال کے پیش نظر اپنے خدشات کا اظہار کیا کہ وقت بہت تھوڑا باقی ہے اور اگر ہم احرام کھول کر اپنی بیویوں سے متمتع ہوں گے تو عبادت میں کمی اور نقص واقع ہوگا جیسا کہ خود اس حدیث کے ترجمہ سے ظاہر ہے کہ یہ حکم نفس کی پیروی کے لیے نہیں بلکہ حکم خداوندی کی تعمیل کے لیے ہے میں تم سب سے زیادہ پرہیزگار اور متقی ہوں اگر قربانی کے جانور مانع نہ ہوتے تو میں بھی اس پر عمل کرتا یا مجھے پہلے یہ قصہ معلوم ہوتا تو میں سوق ھدی ہی نہ کرتا مگر برق صاحب ہیں جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ گویا یہ کام سب واقع ہو چکے تھے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں۔

چنانچہ ہم نے خوب جماع کیا (حالانکہ اس گفتگو کے وقت نفس جماع ہی واقع نہ ہوا تھا
چہ جائیکہ خوب) آگے لکھتے ہیں کہ اور پانچویں دن کے بعد جب ہم عرفہ کے لیے روانہ
ہوئے یہ گفتگو ۴ ذوالحجہ (صبح رابعہ) کو ہوئی تھی اور عرفہ کو روانگی ۹ ذوالحجہ کو ہوئی تھی
پانچویں دن کے بعد چھٹا دن ہوتا ہے اور یہ برق صاحب کو بھی مسلم ہے چنانچہ وہ لکھتے
ہیں کہ اور جب چھٹے دن عرفہ کے لیے نکلے الخ تو کیا برق صاحب کے نزدیک عرفہ کی
تاریخ ۱۰ ذوالحجہ ہے؟ اگر خود ان کو حج کرنے کی توفیق نہیں ہوئی تو کتابوں میں دیکھ لیتے
ورنہ ہزاروں (بلکہ لاکھوں) لوگ ہر سال حج کرتے ہیں اُن سے ہی دریافت کر لیا ہوتا
جن سیاہ بختوں کو یہ مشہور تاریخی حکم بھی سمجھ نہ آسکے تو اگر اُن سے اُمور ثواب و عقاب
یا وحی جلی و خفی مخفی رہے تو تعجب کی کیا بات ہے؟ اور آگے لکھتے ہیں کہ پانچ دن
تک جماع بھی کرتے رہے (نہ معلوم یہ برق صاحب نے کہاں سے اخذ کیا ہے ورنہ
اس حدیث میں تو کوئی لفظ ایسا موجود نہیں ہے جو اس پر دلالت کرتا ہو کہ پانچ
دن تک جماع ہوتا رہا) پھر آگے یہ ملاحظہ کیجئے کہ برق صاحب صحابہ کرامؓ سے متعلق
یہ لکھ کر کہ نطفہ بدستور ٹپک رہا تھا اور یہ کہ اُن کا نطفہ اُچھل اُچھل کر زمین پہ گر رہا تھا۔
کتنی شقاوت قلبی اور سینہ زوری کا ثبوت دیا ہے جس آدمی کو شعائر اللہ سے یہ
چڑ ہو احادیث رسول صلے اللہ علیہ آلہٖ وسلم سے یہ عناد ہو صحابہ کرامؓ سے یہ بیر
ہو بھلا ہدایت ربانی اور توفیق ایزدی کے دروازے اُس کے لیے مسدود نہ ہوں تو
کس کے لیے ہوں؟ الغرض برق صاحب نے صحابہ کرامؓ کی مراد اور حدیث کے
مطلب اور کنایہ کو یا تو سرے سے سمجھا ہی نہیں ہے اور یا سمجھ کر عمداً خیانت کی ہے
اور صحابہ کرامؓ کے ہاں بطور خدشہ جو زمانۂ مستقبل میں ہونا تھا وہ برق صاحب کے
نزدیک ماضی میں ہو چکا تھا اور جماع کے لیے پانچ دن اپنی طرف سے تجویز کر کے
اس پر جو قابلِ رشک حاشیہ چڑھایا ہے وہ قابل دید ہے سچ ہے ع

چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد

برق صاحب کا حدیث پر انیسواں اعتراض

ایک اہم سوال :- کیا مجامعت کے بعد غسل ضروری ہے ؟

جواب : ضروری نہیں۔

زیدؓ بن خالدؓ نے حضرت عثمانؓ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص مجامعت کرے لیکن انزال سے پہلے علیحدہ ہو جائے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے ؟ فرمایا شرمگاہ کو دھو ڈالے اور وضو کرے میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسا ہی سُنا تھا اور علیؓ، زبیرؓ، طلحہؓ اور ابیؓ بن کعب کی رائے بھی یہی ہے (بخاری کتاب الوضو ج ۱ ص ۴۲) ضروری ہے (۲) دخول کے بعد غسل واجب ہو جاتا ہے (مؤطا ص ۲۲)۔ ۳۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا تھا کہ جب کوئی آدمی بیوی کی لاتوں میں بیٹھ کر زور لگانا شروع کر دے تو اس پر غسل واجب ہو جاتا ہے خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۸۵ باب الوضوء ضروری نہیں۔ ۴۔ ابیؓ بن کعب کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص مجامعت کرے اور انزال سے پہلے علیحدہ ہو جائے تو کیا وہ غسل کرے ؟ فرمایا وہ صرف وضو کر کے نماز پڑھ لے (مسلم ج ۱ ص ۸۵) کیا سمجھے ؟ دخول کے بعد غسل ضروری ہے یا غیر ضروری ہے ؟ سمجھنا کیا ہے بھیّا یہ ہے وحی خفی ! ہم وحی جلی کو نہیں سمجھ سکتے ان مخفی اسرار کی تہ تک کیسے پہنچیں ؟ انتہیٰ بلفظہٖ دو اسلام ص ۲۳۱ و ص ۲۳۲ طبع اوّل اور حضرت ابیؓ بن کعب کی روایت ص ۱۶۴ طبع اوّل میں بھی نقل کی ہے اور طبع ششم ص ۱۷۷ میں بھی اور اب طبع ششم میں اس اعتراض کو ص ۲۲۴ پر گول مول کر کے ذکر کیا ہے)

جواب :- ابتدا اسلام میں بلاشک یہ حکم تھا کہ جماع میں انزال کے بغیر غسل واجب نہیں تھا۔ لیکن بعد کو یہ حکم بالکل منسوخ ہو گیا تھا صحابہ کرامؓ میں جن بعض کو نسخ

کا حکم معلوم نہ تھا وہ اسی سابق حکم پر فتوی دیتے[1] تھے اور جن کو نسخ کا حکم معلوم ہو چکا تھا وہ سب سابق فتوی سے رجوع کر چکے تھے اور بالآخر تقریباً سب رجوع کر چکے تھے۔ بہرحال جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا اٹل اور محکم فیصلہ جو احادیث کے ذریعہ جمہور صحابہؓ تک پہنچا وہ صرف یہی تھا کہ مجامعت کے بعد غسل ضروری ہے اگرچہ انزال نہ ہوا ہو اور یہی خلفاء اربعہؓ کا مسلک تھا چنانچہ قاضی شوکانیؒ (وغیرہ) لکھتے ہیں کہ

وذھب الی ذلک الخلفاء الاربعة والعترة والفقہاء وجمھور الصحابة والتابعین ومن بعدھم ــــ وقال ابن عبد البرؒ ان الجمھور الذین ھم الحجة علی من خالفھم من السلف والخلف وانعقد اجماعھم علی ایجاب الغسل وقال النوویؒ وقد اجمع علی وجوب الغسل (منتقی ۔ نیل الاوطار ج ۱ ص ۲۱۳ و ص ۲۱۴)

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نیز اہل بیت فقہاء اور جمہور صحابہ کرامؓ و تابعینؒ اور بعد میں آنیوالوں کا یہی مسلک ہے کہ غسل واجب ہے اگرچہ انزال نہ ہوا ہو۔ حافظ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ سلف و خلف اور جمہور اہل اسلام کا جن کی بات مخالفین پر حجت ہے اس بات پر اجماع ہے کہ غسل واجب ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ وجوب غسل پر اجماع واقع ہو چکا ہے یہ اجماع امام نوویؒ نے شرح مسلم ج ۱ ص ۱۵۵ میں ذکر کیا ہے۔

ہم نے یہ حوالے اس لیے نقل کر دیے ہیں تاکہ ایک تو حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا مسلک اور فتوی بھی معلوم ہو جائے اور ساتھ ہی دیگر صحابہ کرامؓ تابعینؒ تبع

---

[1] حضرت عثمانؓ کا یہ فتوی مؤطا امام مالک طبع مصر ص ۴۲ اور مؤطا امام محمد ص ۶۰ وغیرہ میں مذکور ہے۔

تابعینؒ، اہل بیتؓ، فقہاءؒ اور محدثینؒ کا مذہب اور ان کی تحقیق بھی پیش نظر رہے اور صحیح بات سمجھنے میں کسی طرح کی کوئی گھٹکھلک اور خلجان باقی نہ رہے۔ اب آپ حدیث سُن لیجئے:۔

عن ابیؓ بن کعب قال ان الفتیا التی کانوا یقولون الماء من الماء رخصة کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رخص بہا فی اول الاسلام ثم امرنا بالاغتسال بعدھا رواہ احمد وابوداؤد وفی لفظہ انما کان الماء رخصة فی اول الاسلام ثم نہی عنہا رواہ الترمذی ج ۱ ص ۱۶ وصححہ وقال فی غایة المأمول ج ۱ ص ۱۰۹ بسند صحیح واخرجه ابن ماجة وابن خزیمة وابن ابی شیبة (کذا فی النیل ج ۱ ص ۲۱۵) واخرجه الدارمی کذا فی المشکوٰة ج ۱ ص ۴۹) واخرجه محمد فی مؤطئہ ص ۸۷ والحازمی فی کتاب الاعتبار ص ۳۲ وغیرھم۔

حضرت ابیؓ بن کعب فرماتے ہیں کہ وہ حکم اور فتویٰ جو لوگ اس مضمون کا دیا کرتے تھے کہ انزال کے بغیر غسل واجب نہیں ہوتا یہ ابتداء اسلام میں تھا اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے (باذن جل جلالہ) یہ رخصت دے رکھی تھی پھر آپ نے ہمیں اس کے بعد غسل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ابتداء اسلام میں حضور نے رخصت دی تھی اور بعد کو آپ نے اس سے منع کر دیا تھا۔ ابی بن کعبؓ کی یہ روایت مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ صحیح ابن خزیمہ ابن ابی شیبہ (فی المسند والمصنف) سنن دارمی اور مؤطا امام محمدؒ اور کتاب الاعتبار وغیرہ کتب حدیث وغیرہ میں صحیح سند مروی ہے

اس کی تائید حضرت رافعؓ بن خدیج کی یہ روایت بھی کرتی ہے۔

ثم امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد ذلک بالغسل (مسند

احمد و کتاب الاعتبار ص۳۳ کذا فی النیل ج ۱ ص۲۱۶) کہ پہلے یہ حکم تھا۔ لیکن بعد کو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں غسل کرنے کا حکم دیا ہے۔

ان روایات سے پہلے حکم کے منسوخ ہونے کا بیّن ثبوت ہو گیا ہے اور حضرت عائشہ رض اور حضرت ابوہریرہ رض وغیرہ کی مرفوع روایتوں کا تو برق صاحب کو بھی اقرار ہے جیسا کہ خود انہوں نے نقل کی ہیں کہ مجامعت کے بعد اگرچہ انزال نہ ہو غسل واجب اور ضروری ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ برق صاحب نے حضرت ابیؓ بن کعب کی روایت سے استدلال کیا تھا حالانکہ خود حضرت ابیؓ ابن کعب ہی کی روایت نے یہ معاملہ صاف کر دیا ہے کہ پہلا حکم منسوخ ہو چکا تھا۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے ؎

جادو وہ ہے جو سر پر چڑھ کر بولے

اگر اس پوری تشریح اور تفصیل کے ہوتے ہوئے بھی برق صاحب کو وحی خفی سمجھ نہیں آتی یا وہ اس سیدھی سادھی بات کے مخفی اسرار تک نہیں پہنچ سکتے تو وحی خفی کا یا محدثین کرامؒ کا کیا قصور ہے مزاج کی اصلاح درکار ہے۔ باقی برق صاحب نے طنزیہ طور پر تو یہ لکھا ہے کہ ہم وحی جلی کو بھی نہیں سمجھ سکتے الخ تو اس میں شک ہی کیا ہے؟ برق صاحب نے جو دو قرآن لکھ کر قرآن کی آیات کی تحریف کر کے اللہ تعالیٰ کی کتاب پر ظلم کیا وہ کیا کم ہے؟ اگر اسی کا نام قرآن دانی، نکتہ شناسی اور خدمتِ قرآن ہے تو یہ برق صاحب کی خوش فہمی یا خود فریبی ہے کیا خوب کہا گیا ہے ؎

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

برق صاحب کا حدیث پر بیسواں اعتراض

کیا آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

ٹوٹ جاتا ہے:۔ عن زیدؓ بن ثابت قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم یقول الوضوء مما مست النار (مسلم ج ۱ ص۱۸۶) زید بن ثابت رض
کہتے ہیں کہ میں نے حضور کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ آگ کی پکی ہوئی چیز کھانے کے
بعد نیا وضوء ضروری ہے۔ ۲۔ نہیں ٹوٹتا۔ عن ابن عباس رض ان رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اکل کتف شاۃ ثم صلی ولم یتوضأ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۸۸)
ابن عباس رض کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور نے ایک بکری کا بھنا ہوا بازو تناول فرمایا اور پھر
وضوء کیے بغیر نماز پڑھ لی۔ (انتہیٰ بلفظہ دو اسلام ص ۲۳۳، ۲۳۴ طبع اول و ص ۲۴۳ و ص ۲۴۴
طبع ششم) خلاف معمول برق صاحب نے صرف دونوں حدیثوں کا آپس میں تعارض
بیان کر دیا ہے مگر مزید حاشیہ آرائی نہیں فرمائی نہ معلوم کیوں؟۔

جواب:۔ ابتداء اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا کہ اگر آگ
کی پکی ہوئی چیز کھائی جائے تو وضوء کرنا پڑے گا مگر بعد کو یہ حکم منسوخ ہوگیا تھا جیسا کہ

عن جابر رض قال کان آخر
الامرین من رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم ترک الوضوء مما
مستہ النار رواہ ابوداؤد ج ۱
ص ۲۹ والنسائی ج ۱ ص ۲۲ وابن خزیمۃ رح
وابن حبان رح والطبرانی رح (کذا فی
النیل ج ۱ ص ۲۰۳) وقال النووی
حدیث جابر رض حدیث صحیح و
رواہ اہل السنن باسانیدہم
الصحیحۃ (کذا فی النیل ج ۱
ص ۲۰۴)

حضرت جابر رض روایت کرتے ہیں کہ جناب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو
آخری حکم ثابت ہے وہ یہی ہے کہ آگ
کی پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضوء نہ
کیا جائے یہ روایت ابوداؤد۔ نسائی،
صحیح ابن خزیمہ رح صحیح ابن حبان رح اور طبرانی
(فی الاوسط) وغیرہ کتابوں میں موجود ہے
امام نووی رح فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رض
کی حدیث صحیح ہے اور اصحاب سنن
نے صحیح اسانید سے اس کو نقل کیا ہے

برق صاحب کو اگر ناسخ اور منسوخ کا علم نہیں تو یہ ان کی لاعلمی ہے ان کو مناسب تھا کہ پہلے کسی محدث اور عالم دین سے دریافت کر لیتے اور اگر دیدۂ دانستہ انہوں نے ناسخ اور منسوخ میں تعارض پیدا کر کے لوگوں کو دھوکا دیا ہے تو یہ ان کی کھلی خیانت ہے ممکن ہے کہ ان کے نزدیک یہ ہنر اور قابلیت تصور ہوتی ہو ورنہ وہ بار بار اس کا ارتکاب ہرگز نہ کرتے اور نہ ہی ایسے بے خوف و خطر ہو کر فریب اور دھوکہ دیتے گویا ان کی ان حرکات سے کسی کو خبر تک نہیں ہے ؎

یوں دلیرانہ مے و جام لیے پھرتا ہے
جیسے دنیا میں کوئی صاحب ایماں ہی نہیں

برق صاحب کا حدیث پر اکیسواں اعتراض

سجدے میں بازو کھولنا۔ ہمیں تاکید کی گئی ہے کہ سجدے میں کتے کی طرح بازو مت کھولو حضرت انسؓ سے روایت ہے لا ینبسط ذراعیہ کالکلب (مسلم ج ۲ ص ۹۸) ایک نمازی سجدے میں کتے کی طرح بازو نہ کھولے لیکن ایک اور حدیث میں ہے کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا سجد فرج بین یدیہ حتی یبدو بیاض ابطیہ۔ (مسلم ۲ ص ۹۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں بازوؤں کو اتنا کھول لیتے تھے کہ ان کے بغلوں کی سفیدی تک نظر آنے لگتی تھی (انتہیٰ بلفظہ دو اسلام ص ۲۴۴ و ص ۲۴۵ طبع اوّل اور اب یہ عبارت کافور ہو گئی ہے)

جواب :۔ یہاں بھی برق صاحب کی وہی خیانت یا جہالت (جس کا ذکر بار بار کیا جا چکا ہے) کارفرما ہے ورنہ معاملہ کوئی بھی مشکل نہ تھا کیونکہ ایک حدیث کا محل اور ہے اور دوسری کا اور پھر نہ معلوم تعارض اور تضاد کہاں سے آ گیا؟ نمازی کو حکم ہے کہ جب سجدہ کرے تو دونوں ہاتھوں کو زمین پر لگائے لیکن اپنی کہنیوں اور بازوؤں

کو زمین پر نہ لگنے دے بلکہ اٹھائے رکھے چنانچہ خود اس کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی ہے :۔

اذا سجدت فضع کفیک. وارفع مرفقیک (رواہ مسلم ج ۱ ص ۱۹۴ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۸۳)

کہ جب تم سجدہ کرنے لگو تو اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو زمین پر رکھو اور اپنی دونوں کہنیوں کو زمین سے اُٹھائے رکھو۔ اور اسی کو پہلی حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح کُتا زمین پر لیٹتے یا بیٹھتے وقت اپنے اگلے پاؤں کو (جو بمنزلہ انسان کے بازوں کے ہیں) زمین پر بچھا اور پھیلا کر لیٹتا یا بیٹھتا ہے تو تم سجدہ میں ایسا نہ کیا کرو اور دوسری حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سجدہ کرتے وقت اپنے بازوؤں کو اپنی چھاتی، پیٹ اور پسلیوں سے ہٹا کر اور کھول کر رکھنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ بازو پہلو کے ساتھ ملے اور جڑے ہوتے ہوں جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایسا کر کے عملی نمونہ سامنے رکھ دیا ہے کہ بازو پہلو سے اتنے دور ہٹے ہوئے تھے کہ بغلوں کی سفیدی تک نظر آتی تھی (رواہ مسلم ج ۱ ص ۱۹۴) خلاصہ یہ ہے کہ پہلی حدیث میں بازوؤں کو زمین سے اٹھائے رکھنے کا ذکر ہے اور دوسری میں بازوؤں کو پہلو سے ہٹا کر رکھنے کا حکم ہے ایک حدیث کا محل الگ اور دوسری کا الگ ہے پھر ان میں تعارض کہاں سے آیا؟ یہ برقؔ صاحب کا ہی کمال ہے کہ وہ انبساط۔ بسط اور تفریج بین الایدی کو ایک ہی سمجھتے ہیں اور پھر اس پہ اعتراض کی بنیاد قائم کرتے ہیں۔

لطیفہ :۔ برقؔ صاحب نے پہلی حدیث کا ترجمہ کرتے وقت لکھا ہے کہ ایک نمازی سجدے میں کتے کی طرح بازو نہ کھولے۔ حدیث میں تو ایک کی قید مذکور نہیں ہے شاید یہاں بھی ان کا اجتہاد اپنا کام کر گیا ہو کہ اگر دو تین یا چار یا پانچ یا زیادہ نمازیوں کی پوری جماعت ہو تو ان کو کتے کی طرح بازو کھول لینے چاہیئں ہاں البتہ ایک نمازی ہو تو اس پہ یہ پابندی عائد کی جائے گی کہ وہ کتے کی طرح بازو نہ

کھوئے اور یہ نزلہ ایک نمازی پر شاید اس کی وحدت اور کمزوری کی وجہ سے گرا ہو؟ سچ ہے ع

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

بہرحال ان کی مجتہدانہ قید بے فائدہ اور رائیگاں تو نہ ہوگی البتہ ہماری ناقص عقل اور سمجھ میں نہ آئے تو اپنی کوتاہ علمی ہے ع

یہ اپنی حد نظر ہے کسی کی دید کہاں

برق صاحب کا حدیث پہ بائیسواں اعتراض

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے حضور علیہ السلام سے کہا نری الجہاد افضل العمل افلا نجاھد قال لا لکن افضل الجہاد حج مبرور (بخاری ج۱ ص۱۸۳)

کہ ہماری رائے میں جہاد بہترین عمل ہے کیا ہم جہاد نہ کیا کریں فرمایا نہیں بلکہ حج بہترین جہاد ہے۔ چلو اہل عرب اور ہمارے اُمراء کی تو جہاد سے خلاصی ہوئی قلت وسائل کی وجہ سے ہمارے لیے حج مشکل تھا لیکن ہمارے امراء کے لیے نہایت آسان۔ اہل عرب کے لیے آسان تر کہ انہیں زیادہ مصارف برداشت نہیں کرنا پڑتے گھر سے نکلے ایک دنبہ ذبح کیا کعبہ کے دو چار چکر لگائے مغفرت کا پروانہ مل گیا اور گھٹیا قسم کے جہاد سے جان چھوٹ گئی بڑھیا جہاد والے کو کیا پڑی ہے کہ جان دے کہ گھٹیا جہاد کرتا پھرے (انتہیٰ بلفظہ دو اسلام ص۲۵۷ طبع اوّل اور اب ندارد)

جواب:۔ اس موقع پر بھی برق صاحب نے اپنے اُسی عزیز اور نرالے اجتہاد سے اچھا خاصا کام لے کر اس حدیث کا ایک ایسا مطلب لیا اور اس پر ایسا حاشیہ چڑھایا ہے جس کا اصل حدیث سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے یہ سوال حضرت عائشہؓ نے صنف نازک (عورتوں) کی نیابت کرتے ہوئے کیا تھا اور خود بھی بنفس نفیس جہاد میں شرکت کی اجازت حضور سے طلب کی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے عمومی حالات میں عورتوں کو جہاد کرنے سے منع کیا اور صنفِ نازک کے حق میں جہاد کا جو نعم البدل ہو سکتا تھا (یعنی حج اور عمرہ) اس کا حکم دیا نہ اس حدیث کا تعلق اہلِ عرب کے مردوں سے ہے اور نہ ہی ہمارے اُمراء سے جیسا کہ برق صاحب نے سمجھا ہے کہ وہ گھر سے نکلتے ہی ایک دنبہ ذبح کر دیں اور کعبہ کے دو چار چکر لگا لیں تو جہاد سے ان کی جان چھوٹ جائے گی۔ ہم نے حدیث کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ محض ایک افسانہ نہیں بلکہ حضرت عائشہؓ کا سوال کرنا ہی اس کو واضح کرتا ہے اگر کوئی مرد سوال کرتا تو آپ ایسا جواب کبھی نہ دیتے بلکہ اس کے لیے جہاد میں شریک ہونے کا ہی حکم صادر فرماتے لیجئے اب آپ حضرت عائشہؓ کی صریح دو حدیثیں بھی سنتے جائیے :۔

عن عائشۃؓ قالت استاذنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الجھاد فقال جھادکنّ الحج متفق علیہ (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۱) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے جہاد کرنے کی اجازت طلب کی لیکن آپ نے فرمایا کہ تم عورتوں کے لیے (بہترین) جہاد حج ہے۔

حضرت عائشہؓ کا بنفسِ نفیس جہاد میں شرکت کرنے کا ولولہ اور جوش اور اس کا جواب آپ سن چکے اب ان کی عورتوں کی طرف سے وکالت اور اس کا جواب بھی سن لیں :۔

عن عائشۃؓ قالت قلت یارسول اللہ علی النساء جھاد ؟ قال نعم علیھن جھاد لا قتال فیہ الحج والعمرۃ رواہ ابن ماجہ ص ۲۱۲ (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۲۲) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا عورتوں پر بھی جہاد لازم ہے ؟ آپ نے فرمایا ہاں ان پر ایسا جہاد (لازم) ہے جس میں لڑنے کی نوبت نہیں آتی یعنی حج اور عمرہ۔ اور بخاری (ج ۱ ص ۳۹۰)

میں ایک روایت یوں آتی ہے آپ نے ارشاد فرمایا لکنّ افضل الجہاد حج مبرور
کہ تم عورتوں کے لیے بہترین جہاد حج مبرور ہے۔

برق صاحب سے دریافت کیجئے کہ کیا یہ حکم اہل عرب اور امرائے کے لیے ہے یا صرف عورتوں کے لیے ہے؟ برق صاحب کی جملہ تصانیف (جہانِ نو، دو قرآن، دو اسلام اور ایک اسلام وغیرہ) کے طرزِ استدلال سے صاف طور پر یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ ان کو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے خدا واسطے کی عداوت اور دشمنی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اصل بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے اور اکثر ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتے چلے جاتے ہیں نہ ان میں خدا تعالےٰ کا ڈر اور خوف ہے اور نہ مخلوق خدا سے شرم اور حیا ؎

سمجھ لے تو نتیجہ عشرتِ محفل کا کیا ہوگا!
قریبِ شمع پروانے کو لرزاں دیکھنے والے

برق صاحب کا حدیث پر تیئیسواں ۲۳ اعتراض

لکھتے ہیں کہ اس صفحے پر ایک اور حدیث ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کسی شخص نے حضور سے پوچھا کہ بہترین عمل کون سا ہے فرمایا خدا اور رسول پر ایمان اس کے بعد جہاد اور اس کے بعد حج۔ اوپر والی حدیث (یعنی حضرت عائشہؓ کی حدیث جس کا جواب گذر چکا ہے۔ صفدر) کے مطابق بہترین عمل حج تھا اور اس کے مطابق جہاد (انتہی بلفظہ دو اسلام ص۲۵۷ طبع اول و طبع ششم ص۲۶۰ مگر گول مول)

جواب: حضرت عائشہؓ کی روایت عورتوں کے حق میں ہے اور ان کے لیے بہترین عمل حج ہے اور یہ دوسری روایت مردوں کے حق میں ہے۔ اور ان کے لیے اپنے موقع اور محل پر بہترین عمل جہاد ہے جب ایک حدیث مردوں کے حق میں ہے اور دوسری عورتوں کے حق میں تو ان میں تعارض کیسا، ہاں اگر

برق صاحب کے نزدیک مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق وامتیاز نہیں تو یہ بات ہی الگ ہے لہٰذا حدیث پر برسنے سے قبل ان کو یہ تحقیق کرلینی چاہیئے کہ مردوں میں اور صنف نازک میں کیا فرق ہوتا ہے؟ اس کے بعد حدیث پر تیر چلائیں ع

چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

برق صاحب کا حدیث پر چوبیسواں اعتراض

لکھتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے کہ جان و مال کی قربانی کے بغیر جنت نہیں ملے گی۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ :۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جان و مال لے کر اس کے عوض میں انہیں جنت دے دی ہے۔ لیکن حدیث کا فیصلہ یہ ہے کہ جہاد کرو یا نہ کرو جنت تمہاری ہے

عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ اٰمَنَ باللہ وبرسولہ واقام الصلوٰۃ وصام رمضان کان حقا علی اللہ ان یدخلہ الجنۃ جاھد فی سبیلہ اوجلس فی ارضہ التی ولد فیھا

ابوہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص خدا و رسول پر ایمان لائے، نماز پڑھے اور روزے رکھے اللہ کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اسے جنت میں بھیجے خواہ وہ جہاد کرے یا گھر ہی میں بیٹھا رہے (بخاری ج ۲ صفحہ ۹۰)

انتہیٰ بلفظہٖ دو اسلام ص ۲۵۷ و ص ۲۵۸ طبع اوّل و طبع ششم ص ۲۶۱)

جواب:۔ برق صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ جان و مال کی قربانی کے بغیر جنت نہیں ملے گی۔ تو نہ معلوم ان کے نزدیک کون سا قرآن مراد ہے؟ اگر ان کا کوئی الگ اور جداگانہ قرآن ہے تو ہمیں اس کا کوئی علم نہیں ہے اور اگر وہی قرآن مراد ہے جو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور صحیح حالت میں اب بھی مسلمانوں کے پاس موجود ہے تو اس سے کوئی دلیل اپنے

دعویٰ کی تائید میں ان کو پیش کرنا چاہیئے جو نادر ہے۔ رہی پیش کردہ آیت تو وہ ان کے دعوے پر ہرگز دلیل نہیں ہو سکتی کیونکہ دعویٰ تو یہ ہے کہ جان و مال کی قربانی کے بغیر جنت نہیں ملے گی اور آیت مذکورہ میں کہیں اس کا اشارہ تک موجود نہیں کہ ہر ایک مومن کے ساتھ (خواہ وہ مرد ہو یا عورت بوڑھا ہو یا جوان بیمار ہو یا تندرست لنگڑا، اپاہج، اور اندھا معذور ہو یا صحیح الاعضاء) اشتراء (خرید و فروخت) کا معاملہ ہو چکا ہے اور بغیر اس کے کہ ہر ایک مومن جہاد کرے جنت ہرگز نہ ملے گی حالانکہ خود قرآن کریم میں ان لوگوں کو جو لنگڑے اندھے بیمار اور معذور ہیں جہاد سے مستثنیٰ قرار دیا ہے (دیکھو پ ۵ النسا ۱۳۶ و پ ۲۶ فتح وغیرہ) آیت کا مطلب تو صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے اس بہادر اور شجاع طبقہ سے جو اپنی جان عزیز کو ہتھیلی پر رکھ کر دشمن کا بلا خوف و خطر مقابلہ کرنے کے لیے ہر وقت سینہ سپر رہتا ہے از روئے مہربانی اور عنایت کے ایک گونہ مجازی سودا کیا ہے کہ وہ اپنی جان اور مال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیش کرے اور اللہ تعالیٰ اس کے عوض میں جنت میں اس کو داخل کر کے اپنی خاص مہربانی سے نوازے گا مجازی سودا اس لیے کہا ہے کہ مومن کی اپنی چیز کون سی ہے؟ نہ جان اپنی نہ مال اپنا سب کچھ اسی مالک الملک کا عطیہ اور مہربانی ہے ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آیت مذکورہ میں کہیں بھی اس کا اشارہ تک موجود نہیں کہ مال اور جان کی قربانی ہو تو جنت ملے گی ورنہ نہ ملے گی۔ یہ فیصلہ برق صاحب کی خود اپنی اختراع اور ایجاد بندہ ہے، اب آپ قرآن کریم سے اس مسئلہ کا حل سن لیجیے:۔

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فَضَّلَ اللّٰہُ الْمُجٰھِدِیْنَ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ عَلَی الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَۃً ؕ وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی ۔ (پ۵، سورہ النساء، رکوع ۱۳)

برابر نہیں ہوتے بیٹھ رہنے والے مومنوں سے سوائے ضرر والوں کے (یعنی اندھے، لنگڑے، بوڑھے اور معذور) اور جہاد کرنے والے اللہ کے راستہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ نے فضیلت دی ہے جہاد کرنے والوں کو اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ بیٹھ رہنے والوں پر درجے میں اور ہر ایک کے ساتھ اللہ نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم اور احادیث میں جو درجہ مجاہدین کا بیان کیا گیا ہے، کسی غیر مجاہد کو کسی طرح بھی حاصل نہیں ہوسکتا لیکن آپ نے قرآن کریم کے صریح حکم ہی سے یہ سن لیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان مومنوں کے ساتھ بھی جو باوجود معذور نہ ہونے کے جہاد نہیں کرسکے بھلائی ہی کا وعدہ کیا ہے اور حقیقتہً بھلائی جنت کے بغیر اور کیا چیز ہوسکتی ہے؟ ہاں اگر برق صاحب اللہ تعالیٰ کی وسیع تر رحمت کو مقید کرتے ہوئے اَلْحُسْنٰی اور بھلائی سے نعوذ باللہ جہنم اور دوزخ یا کوئی اور چیز مراد لیتے ہیں تو یہ ان کی خاص اصطلاح ہوگی جو انہوں نے مجتہدانہ رنگ میں اختیار کرلی ہوگی اب انصاف سے فرمائیے کہ کیا یہ فیصلہ صرف حدیث کا ہی ہے کہ جہاد کرو یا نہ کرو جنت مل جائے گی یا قرآن کا فیصلہ بھی یہی ہے؟ بلاشک گنہگاروں کے گناہوں کی بھی کوئی خاص انتہا نہیں لیکن اللہ تعالےٰ کی رحمت تو بہرحال غیر متناہی ہے سچ کہا گیا ہے کہ ؎

اس کے الطاف بہت ہیں کہ گنہگار بہت

جہاد فی نفسہٖ عبادتِ اصلیہ سے نہیں ہے کہ خواہ مخواہ ہمیشہ جاری رکھی جائے بلکہ مشرکین کے فساد کے خطرہ کے وقت جہاد ضروری ہو جاتا ہے بخلاف ایمان

و نماز روزہ کے کہ وہ فی نفسہٖ عبادت ہیں معلوم ہوا کہ جس زمانہ میں ضرورت نہ ہوگی جہاد ضروری نہیں رہے گا۔ ہاں جائز ہوگا اسی فرق کو سمجھانے کے لیے مذکور حدیث میں جَاهَدَ فِیْ سَبِیْلِهٖ اَوْ جَلَسَ فِیْ اَرْضِهٖ الخ کو عبادات مقصودہ سے علیحدہ کر دیا ہے

علاوہ بریں برقؔ صاحب جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بغیر جہاد کے جنت نہیں مل سکتی اور اس پر وہ اپنے زعم میں قرآن کریم سے بھی استدلال کرتے ہیں وہ ہی از راہِ انصاف فرمادیں کہ انہوں نے کتنی مرتبہ فی سبیل اللہ جہاد کیا ہے؟ کون سا قلعہ اور مورچہ اسلام کی راہ میں فتح کیا ہے؟ کتنے کافروں کو مادرِ گیتی پر قتل کر کے گرایا اور کتنے خدا تعالیٰ کے نافرمانوں اور باغیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر ان کے ناپاک اور نجس خون سے زمین کو رنگین کیا ہے؟ کتنے مجرموں کی منحوس لاشوں کو میدان کارزار میں تڑپتے دیکھا ہے؟ کتنی مسلمان عورتوں کی عزت اور ناموس بچانے کے لیے شمشیر و سنان کے زخم بدن پر کھائے ہیں؟ اور قرآن کریم و مساجد کی حفاظت اور نگرانی کے لیے کتنی گولیاں ان کے سینہ میں پیوست ہوئی ہیں؟ ہاں البتہ اگر قرآن کریم کی آیات کی تحریف۔ احادیث صحیحہ کا انکار احادیث موضوعہ سے استدلال صحیح احادیث کے معانی میں تغیر، تقدیر، شفاعت، اللہ تعالیٰ کی عمومی مغفرت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تمام پیغمبروں پر فضیلت کے انکار کا نام برقؔ صاحب کے نزدیک جہاد ہے۔ اور اگر رامچندر، کرشن۔ بدھ اور زرتشت کو ہر لحاظ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم مرتبہ ثابت کرنے کا نام جہاد ہے (عیاذاً باللہ) تو یہ جہاد برقؔ صاحب نے ضرور کیا ہے۔ اور اس جہاد میں یہود بھی ان سے سبقت نہیں لے جا سکتے اور ابلیس لعین بھی برقؔ صاحب کی ان خدمات جلیلہ کو سراہتے ہوئے خوشی سے قلابازیاں لگاتا ہوا اور کہتا ہوگا۔ کہ ؏

آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

برقؔ صاحب کا حدیث پر پچیسواں ۲۵ اعتراض

ابن ماجہ اور ترمذی کی ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے بہتر عمل کونسا ہے۔ ایسا عمل جو تمہارے درجوں کو بلند کرے، جو سونے چاندی کی قربانی سے بہتر ہو۔ اور اس جہاد سے بھی بہتر ہو جس میں تم دوسروں کی گردنیں کاٹتے ہو اور اپنی گردنیں کٹاتے ہو۔ لوگوں نے کہا بتایئے۔ فرمایا۔ اللہ کا ذکر۔ (موطا صہ۲۱) سب سے زیادہ ذکر ایک بھکاری کیا کرتا ہے۔ جو ایک سانس میں دس مرتبہ اللہ کا نام لے کر بھیک مانگتا ہے تو اس حدیث کی رُو سے گویا بھکاری بہشت کے ٹھیکیدار اور سردار ہوں گے۔ اور ہم تم سب ان کے خدمت گار۔ (انتہیٰ بلفظہ دو اسلام صہ۲۵۸، صہ۲۵۹ طبع اوّل و صہ۲۶۲ طبع ششم) اور دوسری جگہ لکھا ہے کہ اور مُلّا کہتا ہے۔ اجی مرنے مارنے میں کیا رکھا ہے صبح شام ست نام جپا کرو (بلفظہ دو اسلام صہ۲۶۲ طبع اول اور اب اس عبارت کو ہضم کر گئے ہیں)

جواب :- بلاشک اپنے وقت اور موقع پر جہاد ایک عمدہ اور بہترین عمل ہے اور بغیر جہاد کے پوری طرح اعلائے کلمۃ اللہ اگر ناممکن نہیں تو کافی حد تک دشوار اور مشکل ضرور ہے۔ مگر وہ کون سا حق پرست عالم ہے جس نے جہاد کی مخالفت کی ہے۔ اور برقؔ صاحب وغیرہ کو صبح و شام صرف ست نام جپنے کی تلقین کی ہے؟ جو نفس پرست مولوی یا مرزا غلام احمد صاحب ایسے جھوٹے نبی گزرے ہیں جنہوں نے جہاد کی مخالفت کی ہے۔ اور اپنے نفس امارہ کی پیروی۔ تو ان کی اس اتباعِ نفسانی سے علمائے حق کو اور دین اسلام کو کوسنے کا کیا مطلب؟ اور اس پر بھی مطلقاً غور نہ کیا کہ جہاد جس میں بظاہر انسانوں کا بے تحاشا قتل، گھروں اور بستیوں کی تباہی، مال و مویشی کی بربادی، فصلوں اور درختوں کی تخریب ایسے اَن گنت

پہلو شامل ہیں جن کو دیکھتے اور سنتے ہی بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی مقصود بالذات عبادت ہے یا کسی اور عبادت کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ برق صاحب تو ماشاء اللہ پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں اس امر سے تو ایک جاہل کلمہ گو بھی واقف ہو گا کہ جہاد گو عبادت ہے لیکن مقصود بالذات نہیں، بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ، نفاذ آئین۔ احیائے قانون، بدنی اور مالی عبادت پر کاربند کرنے، اور مذہبی احکام پر مقید کرنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کی یاد اور اس کی عبادت بلا روک ٹوک ہو سکتی ہے تو جہاد کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ ورنہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی استواری کے لیے جہاد کے ذریعہ سے راستہ کے اس روڑے کو ناچار دور کرنا پڑے گا اور اصل زندگی اور حقیقی عبادت تو اسی کی ہو سکتی ہے جو ہر حالت اور ہر موقع پر اپنے رب کی یاد سے زبان کو تازہ اور رطب رکھتا ہے۔ اور یہی چیز اب دلوں سے نکل چکی ہے ؎

محسوس یہ ہوتا ہے وہی زیست تھی اپنی
اک چیز جو اب تیری نگاہوں میں نہیں ہے

اور حدیث میں جس موقع پر یادِ خدا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ اس مردِ مومن کا ذکر ہے جو بغیر کسی لالچ اور طمع کے محض عشق اور محبت سے سرشار ہو کر اپنے حقیقی آقا کا نام لیتا اور اس کی شوقِ ملاقات کے لیے بیتاب ہوتا ہے۔ مگر برق صاحب کا مجتہدانہ رنگ دیکھئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے بھکاری کے ذکر سے تشبیہ اور ست نام جپنے سے مثال دیتے ہیں جو اپنے پیٹ اور دنیا کے حقیر فوائد اور منافع کے لیے طمع اور لالچ کے طور پر بار بار خدا کا نام لیتا ہے۔ کیا برق صاحب کے نزدیک ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے؟ کہاں یہ ذکر، اور کہاں وہ ذکر جو مومن کے خلوصِ قلب سے نکل کر بارگاہِ خداوندی میں درجہ قبولیت

جاتا ہے ۔ اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ اسی کی طرف پاک کلمات چڑھتے ہیں ۔ اور یادِ خداوی سے ہی مومن کے دل کو تسکین ہو سکتی اور ہوتی ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ لیکن خدا تعالیٰ کی یاد برق صاحب کو بُری ناگوار اور شاق گذرتی ہے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ منافقوں کی طرح وہ بھی خدا کی یاد سے بے تعلق ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یوں ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا اور منافق لوگ بہت ہی کم اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں ۔ حدیث کا معاملہ تو خیر جانے دیجئے قرآن کریم سے متعلق برق صاحب کا کیا ارشاد ہے ؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ۔۔ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا اے ایمان والو ! اللہ کو کثرت کے ساتھ یاد کرو ۔ (پ ۲۲ احزاب ، ۶)

ابن ماجہ اور ترمذی کی روایت تو اس لیے مخدوش ہے کہ وہ بھکاری کو جنت کا ٹھیکیدار بنائی اور ست نام جپنے کا درس سکھاتی ہے ، اور برق صاحب ایسے لائق اور فائق تعلیمیافتہ کو اس ٹھیکیدار کا خدمت گار متعین کرتی ہے ۔ لیکن قرآن کریم کی یہ آیت بھی مومنوں کو یہی سبق سکھاتی ہے کہ وہ کثرت کے ساتھ اس کو یاد کیا کریں ۔ برق صاحب ہی فرمائیں ماجرا کیا ہے ؟ اور قرآن کریم کی اس آیت کا ان کے نزدیک کیا مفہوم اور مطلب ہے ؟ اگر وہ ہمارا یہ احسان تسلیم کرلیں ۔ تو ہم مفت میں ان کی وکالت کرتے ہیں ۔ کہ اس آیت میں حکم مومنوں کو ہے نہ کہ منافقوں کو ؟ اور موصوف کا تعلق ثانی گروہ سے ہے نہ کہ اوّل سے فَلَا مَحْذُوْرَ فِیْہِ مگر ؎

کہاں رندانِ بادہ کش کی محفل اور کہاں واعظ
کوئی حضرت سے پوچھے وہ زمانے کہاں پہنچے

حضرات ! بات دراصل یہ ہے ۔ کہ جب انسان کی نگاہ میں صرف اس دنیائے فانی کی چمک اور دمک ہی انتہائی مقصود ہو ۔ اور خوردن برائے زیستن کے

بجائے حیوانوں کی طرح زیستن برائے خوردن کا قاعدہ پیش نظر ہو اور زندگی کو
محض مادی ترقی کا ایک انتہائی ذریعہ سمجھ لیا جائے جو نہ معلوم کب ختم ہو جائے ؏
دو کروٹیں ہیں عالم غفلت میں خواب کی

تو یقیناً نظریات اور افکار میں فرق آجائے گا۔ اور برق صاحب تو یورپ
کی زرق و برق سے اس قدر متاثر اور مرعوب ہو چکے ہیں اور ان کی نگاہ مادی
ترقیات کو دیکھ کر اس قدر خیرہ اور چکا چوند ہو چکی ہے کہ ان کو روحانیت کے جملہ
مسائل از قسم ناممکنات نظر آتے اور ان کے تمسخر کا بہترین نشانہ ہیں۔ اور ان کے
نزدیک اشیاء کی خوبی و خرابی کا معیار اور حقیقت ان کے زاویہ نگاہ اور نقطہ نظر
میں صرف اپنی عقل نارسا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہ اپنی عقل کی آمیزش اور آویزش
سے صحیح اور سیدھی سادھی بات کو بدمزہ اور بدرنگ بنانے کی انتہائی کوشش
اور کاوش کرتے ہیں۔ لیکن ایک مرد مومن کا نظریہ اس سے بالکل الگ ہے وہ یہ سمجھتا
ہے کہ جتنی یاد الٰہی بڑھتی جائے گی اتنی ہی دل میں رقت اور نرمی پیدا ہو گی اور اس
سوز و گداز میں تعلق باللہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے گا۔ جو لوگ اللہ تعالےٰ
کے سامنے زیادہ سے زیادہ عاجزی پیش کرتے، اور رات کی تنہائیوں میں آنسوؤں
کے نذرانے اس کی بارگاہ میں پیش کرتے، نرم و گرم بستروں سے اٹھ کر روتے
اور گڑگڑاتے ہیں، وہی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا یقین ہوتا ہے۔ کہ
ساری خوشیوں کا دینے والا، اور تمام کامیابیوں کا سرچشمہ وہی ہے اور اسی کا
دروازہ ہے جس سے بار بار سوال کرنے پر انسان ذلیل نہیں خیال کیا جاتا۔ بلکہ عبد
کامل کہلاتا ہے ؎

اسی سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر
یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد

برقی صاحب کثرت سے خدا تعالیٰ کی یاد کرنے والے کو احمق اور ذلیل تصور کیے بیٹھے ہیں۔ لیکن قرآن کریم ان کو عقلمند کہتا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر اولوالالباب اور عقلمندوں کی ایک علامت یہ بھی بتلائی ہے: اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ کہ وہ اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہو کر بیٹھ کر اور اپنی کروٹوں پہ (غرضیکہ ہر حالت میں) یاد کرتے ہیں۔ (پ ۴، آل عمران ۲۷)

الغرض اللہ تعالیٰ کی یاد ایسی اہم بنیادی اور ضروری نعمت ہے جس پر درحقیقت زمین و آسمان کا نظام چل رہا ہے۔ اور قیامت بھی اسی وقت آئے گی (حتّٰی لا یقال فی الارض لا الٰہ الا اللہ (مستدرک ۴ ص ۴۹۴) وقال الحاکم والذھبی علی شرطھما) جس وقت روئے زمین پر ایک متنفس بھی خدا تعالیٰ کی توحید کا اور اس کے ذکر کا، اقرار کرنے والا نہ رہے گا ؎

سب کچھ بھی ہو کے کچھ نہیں دنیائے عشق میں
جو اس کی یاد و وجد میں شامل نہیں رہا

برقی صاحب کا حدیث پر چھبیسواں ۲۶ اعتراض

درختوں کی حفاظت اور نگرانی پر پہلے ایک مختصر سی تمہید لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں یزید بن ابی سفیانؓ کو ایک فوج کا سالار بنا کر شام کی طرف روانہ کیا تو ساتھ ہی مندرجہ ذیل ہدایات بھی دیں۔ کسی عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرنا کوئی پھل والا درخت نہ کاٹنا کوئی عمارت نہ گرانا کسی اونٹ یا بکری کو ذبح نہ کرنا۔ ہاں کھانے کے لیے ضرورت پڑے تو اجازت ہے اور کسی درخت کو ہرگز نہ جلانا (مؤطا امام مالک ص ۱۶۷) لیکن بخاری میں مذکور ہے کہ حضور نے بنی نضیر کے کچھ درخت جلا دیے تھے اور کچھ کاٹ کر رکھ دیے تھے (بخاری ج ۲ ص ۳۱)

اگر حضورؐ نے اس طرح کیا ہوتا تو حضرت صدیقؓ آپ کی سنت کو ضرور زندہ رکھتے اور یزیدؒ کو درخت نہ کاٹنے کی ہدایت کبھی نہ دیتے علاوہ ازیں ہم یہ کیسے تسلیم کریں کہ جو رسول کائنات کے لیے رحمت بن کر آیا تھا جو بڑے بڑے دشمنوں کے گناہ بن کہے بخش دیتا تھا وہ بنی نضیر کے مقابلہ میں اس قدر سنگدل ہو گیا تھا کہ ان کے درختوں کو کاٹتا اور جلاتا پھرتا تھا درخت جنگ نہیں کر رہے تھے درختوں نے آج تک کسی کا کچھ نہیں بگاڑا پھر بلا وجہ اور بلا ضرورت درختوں کو کاٹنا مسافر دل کو سائے اور دراز گردن حیوانات کو غذا سے محروم کرنا رسول کی شایانِ شان تھا اور نہ اس عفوِ مجسم سے یہ فعل سرزد ہو سکتا تھا اس لیے یہ حدیث قابلِ اعتماد نہیں (انتہیٰ بلفظہٖ دو اسلام ص۳۱۰ ص۳۱۱ طبع اوّل اور اب یہ عبارت ہضم ہو چکی ہے)۔

جواب :- اس بات کو جانے دیجیے کہ بنو نضیر کے جو درخت کاٹے اور جلائے گئے تھے وہ حسبِ تحقیق علامہ بلاذریؒ بے کار اور بے فائدہ تھے پھل ان سے حاصل نہیں ہوتا تھا (دیکھیے فتوح البلدان وغیرہ) اور اس کو بھی جانے دیجیے کہ یہود بنو نضیر نے ان درختوں کو اپنا مورچہ اور قلعہ بنا رکھا تھا اور درختوں کی آڑ میں وہ مسلمانوں پر تیر اندازی کرتے تھے اور اس لیے ان کو کاٹا اور جلایا گیا تھا جیسا کہ بعض اربابِ تاریخ نے اس کو ثابت کیا ہے۔ (دیکھیے سیرت النبی شبلیؒ ج۱ ص۲۷۸)

اِن دونوں باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے یہ ملاحظہ کیجیے کہ کیا بنو نضیر کے درختوں کو کاٹنے کا ذکر صرف بخاری وغیرہ کی حدیث ہی میں آتا ہے یا قرآن کریم میں بھی اس کے متعلق کوئی ارشاد موجود ہے؟ برق صاحب ٹھنڈے دل سے سنیں کہ قرآن کریم کا کیا ارشاد ہے مَاقَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ (پ۲۸۔ سورۃ الحشر ۱) رہ

جو کاٹے تم نے کھجور کے درخت یا چھوڑ دیا تم نے ان کو اپنی جڑوں (اور تنوں) پہ قائم اور کھڑا پس اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اور تاکہ وہ نافرمانوں کو رُسوا کرے۔

یہ آیت سورہ حشر کی ہے جس میں یہود بنی نضیر کے ساتھ جنگ اور جہاد کا ذکر کیا گیا ہے اس میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے کہ مسلمانوں نے جو درخت کاٹے یا جو چھوڑ دیئے تھے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اذن اس کے حکم اور اس کی مرضی سے ہوا تھا بخاری کی حدیث میں جس موقع پہ درختوں کے کاٹنے کا ذکر تھا بعینہٖ اسی موقع پہ درختوں کے کاٹنے کا ثبوت قرآن کریم سے بھی صاف طور پر مل گیا اب برق صاحب ہی فرمائیں کہ خالق کائنات نے باوجود رؤف اور رحیم ہونے کے بلا ضرورت درختوں کو کاٹنے کا حکم کیوں دیا؟ دراز گردن حیوانات کو غذا سے کیوں محروم کر دیا؟ مسافروں کو ان کے سایہ سے کیوں مستفید نہ ہونے دیا؟ اور برق صاحب کی خود ساختہ منطق کے رو سے کیا یہ حکم ارحم الراحمین کا ہو سکتا ہے؟ درختوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟ کس سے جنگ کی تھی؟ پھر کیا یہ حکم خدا تعالیٰ کے شایانِ شان ہو سکتا ہے؟ لہذا یہ آیت ہی قابلِ اعتبار نہیں جو انسان کو سنگدل بننے کا درس دیتی ہے (عیاذاً باللہ) یہ تھی برق صاحب کی خانہ ساز منطق جس کے رُو سے نہ حدیث محفوظ رہی نہ قرآن نہ رسول کی ذات بچی اور نہ اللہ تعالیٰ کی ورا الورا ہستی انہوں نے تو صرف یہی خیال کیا کہ حدیث بخاری پر بم پھینکا جا رہا ہے لیکن ان کو معلوم نہیں کہ اکثر صحیح احادیث کا قرآن کریم سے چولی دامن کا ساتھ ہے جہاں حدیث کا انکار کر دیا ساتھ ہی قرآن کی کسی آیت کا بھی انکار لازم آگیا جیسا کہ یہاں ہوا اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسی سمجھ سے محفوظ رکھے جیسے برق صاحب اور ان کے دوستوں کی ہے خدا کرے کہ ان کو معمولی سی سمجھ ہی آجائے ؎

ہر چند زندگی ہے کسی اور شئے کا نام
جینے کے واسطے غمِ دنیا بھی چاہیئے

چونکہ برقؔ صاحب کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس لیے جس طرح ہم پر اس آیت کے پیش نظر درختوں کے کاٹنے کا فلسفہ اور حکمت بیان کرنی ضروری ہے اسی طرح ان پر بھی یہ فریضہ عائد ہوتا ہے خیر وہ جو فلسفہ اور تحقیق بیان فرمائیں گے وہ تو اُن ہی سے پوچھے گا جو ہمیں معلوم ہے وہ ہم عرض کر دیتے ہیں بات یہ تھی کہ یہود بنو نضیر نے جب دیکھا کہ مسلمان قوم کے ساتھ لڑائی کرنا پھولوں کا فرش نہیں وادیٔ پُرخار ہے۔ قدم قدم پر تکالیف اور مصائب کا سامنا ہے اور رہ ہر موڑ پر آزمائشیں ہیں اور امتحان پر امتحان حق شناسوں کی تلواروں کی دھاریں اور نیزوں کی نوکیں ہر وقت ان کے سینوں میں پیوست ہونے کے لیے بیتاب ہیں اور اُن کے لیے پینے کے لیے آبِ تیغ اور کھانے کے لیے خنجر اور شمشیر کے پھل موجود ہیں۔

جب یہ حالت دیکھی تو وہ اپنے مضبوط قلعوں میں بند ہو گئے مسلمانوں نے بڑی کوشش کی لیکن انہوں نے نکلنے کا نام تک نہ لیا اندر ہی اندر اپنا ڈیفنس اور سازشوں کو تیز تر کرتے رہے ناچار مسلمانوں نے ان کے بعض درخت کاٹے اور بعض جلا کر خاک سیاہ کر دیے تاکہ یہود کو غیرت آئے اور جوش میں شاید وہ کسی طرح مرد میدان بن کر لڑائی کرنے یا ہتھیار ڈالنے کے لیے آمادہ ہو جائیں چنانچہ مسلمانوں کی یہ حکمت اور لطیف حیلہ مفید ثابت ہوا اور درختوں کو ضائع ہوتے دیکھ کر یہود بیتاب ہوئے لڑائی کی اور بالآخر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے مسلمان ان کے فتنوں اور سازشوں سے محفوظ ہو گئے۔ جب منافقوں نے درختوں کو ضائع ہوتے دیکھا تو اسی طرح کی منطق سے کام لیتے ہوئے انہوں نے بھی اعتراض کیا جس طرح آج برقؔ صاحب نے اعتراض در اعتراض کر کے ان کی نیابت کا حق ادا کیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان منافقوں کو جواب دیا اور یہ آیت نازل فرمائی کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی مرضی سے ہوا ہے اور تاکہ فاسقوں (یہود اور نیز دیگر اعتراض کرنے والوں) کو خوب رسوا اور ذلیل

کردیا جائے (دیکھئے تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۳۳ خازن ج ۶ ص ۱۱۹ و بیضاوی ۶ ص ۲۱۹ وغیرہ)
یہ تھا برقؔ صاحب کا حدیث پر اعتراض جس کا ہم نے تارو پود بکھیر دیا ہے۔ والحمد للہ علیٰ ذلک اس سے قبل شاید زبانِ حال سے وہ یہ پڑھتے رہتے ہوں گے ؎

کیا ہے کن اُمیدوں سے فراہم آشیاں میں نے
خدارا موسمِ گُل تک میرے صیاد رہنے دے

برقؔ صاحب کا حدیث پر ستائیسواں اعتراض

مصر کے والی المقوقس نے حضور کی خدمت میں دو لونڈیاں بھیجی تھیں جن میں سے ایک بقول راوی آپ نے اپنے گھر میں رکھ لی تھی اور اسی سے ابراہیم پیدا ہوا تھا، صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے کہ خدائے تعالیٰ تین آدمیوں کو دُگنا معاوضہ دے گا اوّل وہ یہودی یا عیسائی جو اپنے رسولوں پر ایمان لانے کے بعد حضور پر بھی ایمان لے آئے، دوم وہ غلام جو خدا اور اپنے آقا دونوں کے حقوق ادا کرے اور سوم وہ شخص جو لونڈی کو تعلیم اور تربیت دے کر پہلے آزاد کرے اور پھر نکاح کر لے (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۹۹) یہ تھا رسولؐ کا ارشاد۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا حضورؐ نے ماریہ قبطیہؓ کو آزاد کر کے اُس سے نکاح کیا تھا؟ اگر ایسا کیا تھا تو سیرت نگاروں نے آپ کا نام ازواج مطہراتؓ میں کیوں درج نہ کیا اگر نہیں کیا تھا تو دوسروں کو حکم کیوں دیا۔ اس لیے یہ ماریہ قبطیہؓ کو گھر میں رکھنے اور اُس سے ابراہیمؑ کے پیدا ہونے کا افسانہ غلط ہے (انتہیٰ بلفظہ حاشیہ دو اسلام ص ۲۱۹ و ص ۲۲۰ طبع اوّل اور طبع ششم ص ۲۲۹ و ص ۲۳۰ لیکن اس میں اس لیے الخ کے بعد سطر حذف کر دی ہے)۔

جواب:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم کے عہد مبارک سے لے کر آج تک مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر مسلک کے لوگوں نے (جن میں محدثین، مؤرخین، مفسرین

فقہاء۔ اولیاء۔ اور منطقی بھی قسم کے لوگ شامل ہیں) بلا اختلاف یہ بات نقل کی ہے کہ آپ کی لونڈیوں میں ایک حضرت ماریہ قبطیہؓ بھی تھیں اور انہیں کے بطن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ والہٖ وسلّم کے لختِ جگر حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں ان کی وفات ہوگئی تھی مگر آج چودھویں صدی میں برقؔ صاحب کی تحقیق اور اجتہاد کا یہ فیصلہ ہے کہ نہ تو حضرت ماریہ قبطیہؓ حضور کے گھر رہیں اور نہ اُن سے ابراہیم علیہ السّلام کا تولّد ہوا اور اس کو صرف افسانہ کہنے پر راضی نہیں بلکہ افسانہ کے ساتھ غلط ہے کا اضافہ بھی فرماتے ہیں اور یہ تحقیق بھی انہوں نے اہلِ یورپ کی تقلید کرتے ہوئے اختیار کی ہے چونکہ یورپ کے پوپ اور پادری صاحبان تعدد ازواج، سراری (لونڈیوں کا مسئلہ) اور غلامی کا مسئلہ لے کر اسلام پر کیچڑ اچھالا کرتے ہیں اور اس وقت غلاموں کا سلسلہ گو مفقود ہے لیکن جب کتب احادیث و سیرت میں ان کا ذکر آجاتا ہے تو مغربیت زدہ لوگ یا سرے سے ان کا انکار کر دیتے ہیں اور یا ایسی رکیک اور بے جا تاویلات کرتے ہیں جن پر ایک معمولی سمجھ اور عقل والا انسان بھی ہرگز مطمئن نہیں ہوسکتا برقؔ صاحب نے دیگر مسائل کی طرح سراری (لونڈیوں) کے مسئلہ کو بھی یورپ کی عینک سے دیکھنے کی تکلیف فرمائی ہے اور جس مقام پر وہ پہنچے ہیں اس کو دیکھ کر افسوس تعجب اور حیرت ہوتی ہے ؎

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے

برقؔ صاحب کے استدلال کے مرکزی مقدّمے صرف دو ہیں اول یہ کہ جب حضور نے لونڈیوں کو آزاد کر کے اُن سے نکاح کرنے کی ترغیب دی ہے تو پھر ماریہ قبطیہؓ کو بھی آزاد کر کے اُن سے نکاح کر لیا ہوتا۔ دوم یہ کہ لونڈی کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے گھر میں رہنا افسانہ ہی نہیں بلکہ غلط بھی ہے اور مزید براں اُن کے پیٹ سے لڑکے (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کا پیدا ہونا یک نہ شد دو شد کا

مصداق ہے۔

پہلے مقدمہ کا جواب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صفیہؓ اور حضرت جویریہؓ کو (یہ دونوں جنگ میں گرفتار ہوکر لونڈیوں کی شکل میں بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں آئی تھیں) آزاد کرکے ان دونوں سے نکاح کرکے ان کو ازواج مطہراتؓ کے زمرہ ہی میں داخل کر لیا تھا اور سیرت نگاروں نے ان کو ازواج مطہراتؓ ہی کے گروہ میں درج کیا ہے (دیکھئے کتب حدیث وغیرہ مثلاً مستدرک جلد ۲۶ وص ۲۸ اور ابن کثیر ج ۲ ص ۲۹۹ وص ۵۰۰ وغیرہ) آپ نے جو حکم دوسروں کو دیا تھا اس پر خود بھی عمل کرکے صحیح نمونہ پیش فرما دیا تھا اور بجائے آپ کے دونوں کو آزاد کرکے ان سے نکاح کر لیا تھا تاکہ برق صاحب جیسے محقق اور مجتہد کو یہ کہنے کا موقع ہی نہ مل سکے کہ حضور نے فرمایا کیا تھا اور کیا کیا؟

دوسرے مقدمے کا جواب :-

حدیث کا انکار تو اس لیے کیا کہ اس میں لونڈی کو گھر میں رکھنے کا حکم بیان عیاں کیا گیا ہے لیکن قرآن کریم کی ان آیات کے متعلق کیا ارشاد ہے جن میں حضور علیہ السلام کے گھر لونڈیوں کے رکھنے کی صراحت ملتی ہے چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے :- يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ (پ ۲۲ - احزاب ۶)

اے نبی تحقیق سے ہم نے حلال کر دی ہیں آپ کے لیے آپ کی وہ بیبیاں جن کو آپ ان کا مہر ادا کر دیا ہے اور وہ لونڈیاں (بھی ہم نے آپ کے لیے حلال کر دی ہیں) جن کے آپ اللہ تعالیٰ کے انعام اور مہربانی سے مالک ہو چکے ہیں برق صاحب

ہی فرمائیں کہ حضرت ماریہ قبطیہؓ نہ سہی کوئی اور ہی سہی قرآن کریم کا ارشاد تو صاف ہے کہ آپکی ملک میں کچھ لونڈیاں ضرور تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آپکے لیے حلال کر دیا تھا۔ اور ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ (پ۲۲، احزاب) یعنی یہ کہ پہلی بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر ان کے عوض میں اور نکاح کر لیں تو یہ آپ کے لیے حلال نہیں ہے اگرچہ خوش لگے آپ کو اُن اور بی بیوں کا حسن مگر وہ لونڈیاں جن کے آپ مالک ہو جائیں وہ آپ کے لیے حلال ہیں۔

پہلی آیت میں اُن لونڈیوں کا ذکر تھا جو آپ کے تصرف میں آچکی تھیں اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو یہ ضابطہ اور قانون بتلا دیا کہ آئندہ آپ نکاح کی صورت میں ازواج کی تعداد میں اضافہ نہیں کر سکتے اگرچہ کسی نئی بی بی کا حسن آپ کو کتنا ہی پسند اور دلکش کیوں نہ معلوم ہو۔ ہاں البتہ آپ کو اس کی اجازت ہے کہ اس کے بعد بھی آپ جتنی لونڈیاں چاہیں تصرف میں لا سکتے ہیں۔ برقؔ صاحب ہی فرمادیں کہ کیا ہم یہ تسلیم کر لیں کہ حضور علیہ السلام کے کے گھر لونڈیاں رہتی تھیں اور آپ کو آئندہ ان کی تعداد میں اضافہ کرنے کا حق بھی دے دیا گیا تھا۔ یا ان قرآنی آیات کو بھی غلط افسانہ سمجھ لیں؟ (نعوذ باللہ من سوء الفهم والتعنت)

---

[1] قرآن کریم سے اجمالاً یہ تو ثابت ہو گیا کہ آپ کے پاس کچھ لونڈیاں تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آپکے لیے حلال کر دیا تھا کتب حدیث اور تاریخ وغیرہ میں ان کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ حضرت ماریہؓ اور حضرت ریحانہؓ (دیکھئے ابن کثیر ج ۳ ص ۴۹۹) اور مستدرک ج ۴ ص ۴۲ وغیرہ میں حضرت جمیلہؓ اور ایک لونڈی کا ذکر بھی آیا ہے۔

قارئین کرام آپ نے ملاحظہ کر لیا کہ صحیح حدیث کے انکار کرنے سے حدیث ہی کا انکار نہ ہوا بلکہ قرآن کریم کی صریح آیات کا بھی صاف طور پر انکار لازم آگیا اور حدیث کو غلط افسانہ قرار دینے سے قرآن کریم کو بھی غلط افسانہ بنانا اور کہنا پڑا۔ (عیاذاً باللہ) ؎

چمن میں تھیں ڈالیاں ہزاروں مگر مقدر کا کھیل دیکھو
گری اسی شاخ پر ہے بجلی بنایا جس پر تھا آشیانہ

برق صاحب کا حدیث پر اٹھائیسواں اعتراض

حضرت انسؓ سے اسی مضمون کی روایت بخاری وغیرہ میں آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جملہ ازواج سے مجامعت کی اور جو ازواج آپ کے نکاح میں آئی تھیں ان سب کی تعداد گیارہ تھی حضرت انسؓ سے سوال کیا گیا کہ آپ اس کی طاقت رکھتے تھے انہوں نے جواب دیا ہم یہ گفتگو کیا کرتے تھے کہ آپ کو تیس ۳۰ مردوں کی طاقت عطا کی گئی ہے برق صاحب اس حدیث کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ :-

یہ حدیث صریحاً غلط ہے (دو اسلام ص ۲۱۷ طبع اوّل اور اب یہ حذف کر دیا ہے) اور اس پر کافی طویل بحث کر کے آگے لکھتے ہیں کہ میرا یہ خیال ہے کہ حضور نے مدینہ میں آکر ازواج مطہراتؓ کو بطور شوہر استعمال ہی نہیں فرمایا تھا اور اس پر کئی قرائن ملتے ہیں۔

اوّل آپ کافی سن رسیدہ ہو گئے تھے دوم کسی بیوی کا حاملہ تک نہ ہونا اس پر شاہد ہے (اور لکھتے ہیں کہ لونڈی کے پیٹ سے تو رسولؐ کی اولاد ہو اور نو بیویوں میں سے کوئی حاملہ تک نہ ہو تعجب، حیرت !! دو اسلام ص ۲۲۰ طبع اوّل و ص ۲۳۰ طبع ششم سوم تجربہ بتلاتا ہے کہ مصروفیات بڑھ جائیں تو انسان ازدواجی زندگی کے فرائض سرانجام دینے کے لیے نہ وقت نکال سکتا ہے اور نہ اس میں خواہش پیدا ہوتی

ہے کمال اتاترک اور نپولین جب بہت مصروف ہو گئے تو ایک ایک بیوی کو بھی مطمئن نہ کر سکے اور وہ چلتی بنیں۔ ہٹلر اس قدر مصروف تھا کہ وہ شادی کے معاملہ پر سوچنے کی فرصت بھی نہ نکال سکا اور ہمارے آقا تو اس قدر مصروف تھے کہ اللہ کی پناہ ۱ھ میں مسجد کی تعمیر اور قبائل سے معاہدے ۲ھ میں جنگ بدر، جنگ احد، سریہ غطفان اور سریہ ابوسلمہ ۳ھ میں مفتوحہ علاقے کا انتظام، فوجوں کی اسلحہ بندی راشن وغیرہ کے انتظامات مجروحین اور مقتولین کے متعلق تدابیر ۴ھ میں جنگ ابی سلمہ، جنگ ابن انیس، حادثہ بئر معونہ، غزوہ بنی قینقاع اور غزوہ بنی نضیر ۵ھ میں غزوۂ بنی مصطلق غزوہ خندق جنگ دومۃ الجندل جنگ مریسیع الخ۔ (دو اسلام ص۲۲۰ و ص۲۲۱ بلفظہٖ طبع اوّل و ص۲۳۱ طبع ششم) پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ساری قوم کا غم، سارے عرب کی فکر، دشمنوں کی فتنہ انگیزی سے پریشانی، دن بھر روزہ، تقریباً رات بھر عبادت خدا کے لیے بتاؤ کہ انہیں گیارہ گیارہ بیویوں کے ساتھ مباشرت کی فرصت کیسے مل سکتی تھی (دو اسلام ص۲۲۲ طبع اول و ص۲۳۲ طبع ششم) یہ سب کچھ لکھ چکنے کے بعد آخری فیصلہ یوں صادر فرماتے ہیں کہ اس لیے میری رائے میں یہ مباشرت و مجامعت کے قصے من گھڑت ہیں (دو اسلام ص۲۲۳ طبع اوّل و ص۲۳۳ طبع ششم)

جواب :۔ اس سے قبل کہ ہم برق صاحب کے قرائن اور مقدمات کے جوابات عرض کریں چند ایک نہایت ضروری اور ضمنی اجزاء پر بحث کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ایسے اور بھی کافی ہیں۔ مگر ہم صرف چند ہی عرض کرتے ہیں اور اس بحث کو ہم اس لیے بھی قدرے تفصیل سے بیان کرنا پسند کرتے ہیں کہ دور جدید کے ایک نئے مجدد اور مجتہد مودودی صاحب نے بھی اس حدیث پر محض اپنی عقل کی وجہ سے کافی لاطائل اور بے سود لے دے کی ہے۔

۱۔ یہ ٹھیک ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالہ نکاح میں مختلف اوقات میں گیارہ ایسی ازواج مطہرات آچکی تھیں جن سے آپ نے مخصوص ازدواجی تعلق قائم کیا جن کے اسماء گرامی یہ ہیں:۔

حضرت خدیجہ۱، حضرت سودہ۲، حضرت عائشہ۳، حضرت زینب۴ ام المساکین حضرت جویریہ۵، حضرت زینب۶ بنت جحش، حضرت ام سلمہ۷، حضرت ام حبیبہ۸، حضرت صفیہ۹، حضرت حفصہ۱۰ اور حضرت میمونہ۱۱ رضی اللہ تعالیٰ عنہن جمیعات۔ لیکن گیارہ بیک وقت موجود نہ تھیں۔

حضرت خدیجہ رض کا سنہ۱۰ نبوت میں انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت آپ کے نکاح میں اور کوئی زوجہ نہیں آئی تھیں، اور حضرت زینب ام المساکین رض نکاح کے تقریباً تین ماہ بعد سنہ ۳ھ میں وفات پاگئی تھیں۔ بیک وقت آپ کے نکاح میں صرف نو۹ ازواج مطہرات رض تھیں۔

۲۔ حضرت سودہ رض بنت زمعہ جب کافی سن رسیدہ ہوگئیں تو انہوں نے اپنی باری اور نوبت اپنی مرضی سے حضرت عائشہ رض کو دے دی تھی (متفق علیہ مشکوٰۃ ج۱ ص۲۷۹) اس لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف آٹھ بیویوں سے ہی مخصوص ازدواجی تعلق رکھتے تھے۔ اور جس حدیث میں سب ازواج سے مجامعت کا ذکر آتا ہے اس سے صرف یہی آٹھ مراد ہیں۔ ویسے ضمنی طور پر راوی نے تمام ازواج مطہرات رض کا ذکر کر دیا ہے۔ کہ ان کی تعداد گیارہ تھی۔ نہ یہ کہ جن سے آپ نے ایک رات کے اندر مخصوص طواف کیا وہ گیارہ تھیں۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ازواج سے (جن کی تعداد آٹھ تھی) باری مقرر کر رکھی تھی جیسا کہ متعدد صحیح احادیث سے یہ ثابت ہے۔ اور باری باری آپ ہر بیوی کے پاس رات بسر کرتے تھے۔ ہاں البتہ دو مرتبہ صرف آپ نے

ان جملہ ازواج کی مرضی سے سب کے ساتھ مجامعت کی ایک مرتبہ بغسل واحد (متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۴۹) کہ آپ نے سب پر مخصوص چکر کاٹنے کے بعد صرف ایک ہی غسل کیا اور دوسری مرتبہ کان یغتسل عند ھٰذہ وعند ھٰذہ (رواہ احمد والنسائی وابن ماجۃ والترمذی، مشکوٰۃ ج ۱ ص ۵۰ ونیل الاوطار ج ۱ ص ۲۳۱) کہ آپ نے سب پر مخصوص طواف کرنے کے بعد ہر ایک کے پاس جانے سے قبل الگ اور جدا غسل کیا اس کے علاوہ ساری زندگی میں احادیث کے رو سے ثابت نہیں ہے کہ آپ نے ہر رات ایسا عمومی طواف کیا ہو باقی کان یطوف اور کان یدور سے مغالطہ لگ جانا صحیح نہیں ہے تحقیق پہلے گذر چکی ہے امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ لفظ کان اگرچہ مضارع پر داخل ہو دوام اور استمرار کو نہیں چاہتا (شرح مسلم ج ۱ ص ۲۵۴)۔

۴۔ چونکہ حضرت انسؓ کی مذکور حدیث میں اس کی کوئی تعیین نہیں کہ یہ دونوں واقعے کب پیش آئے؟ اس لیے بہت ممکن ہے کہ یہ ۸ھ سے قبل کے ہوں اور اس سے قبل ازواج مطہراتؓ کی ذکر کردہ تعداد آٹھ سے بھی کم تھی ان ضمنی ابحاث کے بعد اب آپ برق صاحب کے مرکزی قرائن کے جوابات سنیئے:۔

لہ اس پہلو پر عمل کر کے آپ نے امت کو یہ بھی بتلا دیا کہ ازواج کی مرضی سے ایسا کرنا بھی جائز اور صحیح ہے اور بعض محدثین کرامؒ فرماتے ہیں کہ آپ سفر سے واپس تشریف لائے تھے اور کافی عرصہ باہر رہ چکے تھے اور ابھی تک باقاعدہ باری مقرر نہیں ہوئی تھی اس ضرورت کے تحت یہ واقعہ پیش آیا (قالہ ابن عبدالبر وغیرہ نیل الاوطار ج ۱ ص ۲۳۱)

پہلے قرینہ کا جواب: جس بزرگ ہستی کی جوانی پاکدامنی اور عفت کے بلند معیار پر بسر ہوئی ہو اور جس پاک ذات نے اپنے نفس اور خواہشات پر ہر طرح سے بتائید خداوندی پورا پورا قابو پایا اور کنٹرول کیا ہو اور جس کی زندگی کے بالکل آخری ایام میں بھی صرف چند ہی بال سفید ہوتے ہوں اور جس کے قوائے طبعیہ تمام دوسرے ابنائے زمان سے بدرجہا زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوں یہ بات انصاف سے بعید تر ہے کہ ایسی ہستی کو ایسا سن رسیدہ تصور کر لیا جائے کہ وہ بیوی کے کام کا بھی نہ رہے حتیٰ کہ اُن میں خواہش تک بھی پیدا نہ ہو جب کہ اس دور فحش اور اختلاط میں بیسیوں آدمی آپ کو ایسے مل سکتے ہیں جو ستر برس سے زائد عمر میں بھی شادی پر شادی کئے چلے جاتے ہیں برق صاحب ہی ازروئے انصاف یہ فرمائیں کہ ان کا یہ لکھنا کہ آپ کافی سن رسیدہ ہو چکے تھے میرا خیال ہے کہ حضور نے مدینہ میں آکر ازواج مطہرات کو بطور شوہر استعمال ہی نہیں کیا۔ کہاں تک صحیح ہے؟ اور جن ازواج کے ساتھ آپ نے مدینہ طیبہ میں نکاح کیا تھا اُن کا مخصوص حق تو ایک مرتبہ بھی ادا نہ ہوا۔ اور اکثریت ان ازواج ہی کی تھی جن سے آپ نے مدینہ طیبہ میں نکاح کیا تھا۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر آتا ہے کہ جب باذن الٰہی (حضرت جبرائیل علیہ السلام کے توسط سے) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت ملی تو حضرت ابراہیمؑ کی اہلیہ محترمہ نے فرمایا مجھے اولاد ملے گی جب کہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں وَهٰذَا بَعْلِي شَيْخًا اور یہ میرا خاوند بھی بوڑھا ہے۔ ارباب تاریخ نقل کرتے ہیں کہ اُس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر سو برس کی تھی (البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۶۱) اور برق صاحب کی مُسلّم کتاب میں یوں مرقوم ہے: تب ابراھام سرنگوں ہوا اور ہنس کر دل میں کہنے لگا کہ کیا سو برس کے بڈھے سے کوئی بچہ ہوگا اور کیا سارہ کے جو نوے برس کی ہے اولاد ہوگی۔ توراۃ پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۷ اور لکھا ہے اور جب ابراہام سے ھاجرہ

کے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی ۸۶ برس کا تھا (پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۶) اور قرآن کریم میں حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر بھی آیا ہے کہ جب ان کو حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی خوشخبری ملی تو اُس وقت اُن کی ہڈیاں کمزور سر کے بال بالکل سفید اور کمر سوکھ چکی تھی وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا کہ میری ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں اور سر کے بال بالکل سفید ہو چکے ہیں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اُن کی عمر اس وقت ایک سو بیس ۱۲۰ برس تھی (دیکھئے خازن ج ۱ ص ۲۹۲ وغیرہ) اور اُن کی اہلیہ محترمہ کی عمر اٹھانوے برس کی تھی۔ (بیضاوی ج ۱ ص ۲۹۲ وخازن وغیرہ) اور تورات میں لکھا ہے۔ اور موسیٰ اپنی وفات کے وقت ایک سو بیس ۱۲۰ برس کا تھا اور نہ تو اس کی آنکھ دھندلانے پائی اور نہ اس کی طبعی قوت کم ہوئی (تورات استثنا باب ۳۴ آیت ۷) برق صاحب ہی فرمائیں کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت زکریا اور حضرت موسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کی طبعی قوت تو سو ۱۰۰ سال کے بعد تک بدستور قائم رہے اور تولید کے قابل ہوں اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ والہٖ وسلّم ساٹھ سال کے لگ بھگ ہی سن رسیدہ ہو جائیں کہ ازواج مطہراتؓ کے طبعی فطری اور شرعی حقوق ادا کرنے کے قابل بھی نہ رہیں؟ کیا اس ظلم کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی جا سکتی ہے؟ جب کہ قرآن کریم اور حدیث شریف میں بیویوں کے ساتھ حسنِ معاشرت اور ادائے حقوق کی تلقین کی گئی ہے اور فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ آپ نکاح پر نکاح کرتے چلے گئے اور اپنی ایک زوجہ مطہرہ کا فطری اور شرعی حق بھی ادا نہ کیا برق صاحب ہی ارشاد فرمائیں کہ اگر کسی غیر مسلم کے سامنے یہ نظریہ پیش کیا جائے تو وہ پیغمبر اسلام علیہ السلام کے بارے میں کیا نظریہ قائم کرے گا؟ افسوس کہ برق صاحب اپنی ناقص رائے کو خدمت اسلام تصور کیے بیٹھے ہیں اور وہ بھی یہ [illegible] آقاؤں کو راضی کرنے اور رکھنے کے لیے مگر ع

حرم میں رہ کے ہم رازِ صنم خانہ سمجھتے ہیں

دوسرے قرینہ کا جواب :۔

رحم میں حمل کا استقرار اور عدم استقرار اور اولاد کا پیدا ہونا یا نہ ہونا یہ کسی بشر اور انسان وغیرہ کے بس اور اختیار کی بات نہیں ہے یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے وہ جیسا چاہے کرے اس پر کسی کا زور نہیں چل سکتا اور نہ اس کے ارادہ کو کوئی روک سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہی نہ تھا کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور حضرت ماریہؓ کے بغیر کسی زوجۂ مطہرہؓ سے آپ کی اولاد ہو تو اس کے ارادہ اور مشیت کو کون بدل سکتا تھا علاوہ بریں کسی عورت کے حاملہ نہ ہونے سے نفس مجامعت کی نفی کیونکر صحیح ہو سکتی ہے؟ کیونکہ نہ تو اس میں شرعی، اور عرفی تلازم ہے اور نہ منطقی بیسیوں عورتیں اب بھی ایسی موجود ہیں کہ کافی عرصہ تک باوجود مجامعت کے وہ حاملہ نہیں ہوتیں بلکہ بعض کو تو ساری عمر تک اولاد نصیب نہیں ہوتی، برق صاحب ہی فرمائیں کہ حضرت سارہؑ کو نوّے ۹۰ سال تک اور حضرت زکریا علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ کو اٹھانوے ۹۸ سال تک اولاد کیوں نہ ملی؟ اور وہ کیوں حاملہ نہ ہوئیں؟ یہی کہا جائے گا کہ جب تک اللہ تعالےٰ کو منظور نہ تھا کچھ نہ ہوا اور جب اللہ تعالیٰ نے مہربانی کی تو ان کو اولاد ملنے پر تعجب بھی ہوا اور حیرت بھی ہوئی لیکن جب اس نے نوازش فرمائی تو ع

ابھی آئے تھے اور لے کر خدا جانے کہاں پہنچے

تیسرے قرینہ کا جواب :۔

برق صاحب بھی عجیب آدمی ہیں حضرات انبیاءِ عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی پاک ہستیوں اور پاک زندگیوں کا ہٹلر اور نپولین کی ناپاک زندگیوں پر قیاس کرتے ہیں جن کی زندگی ہوٹلوں، سینماؤں، ناچ گھروں اور کلبوں میں گذری ہو اور جو شادی نہ کرنے پر یہ دلیل پیش کرتے ہوں کہ جس شخص کو ہر وقت تازہ بتازہ دودھ ملتا ہو؟

اس کو دروازے پر گائے اور بھینس باندھنے کی کیا ضرورت ہے؟ برقؔ صاحب
کو قیاس اور مثال کے لیے حضرت آدم حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت
یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت
زکریا علیہم الصلوات والتسلیمات کی پاک زندگیاں کیوں نہ نظر آئیں؟ باوجودیکہ وہ
تبلیغ احکام اور دیگر تمام دینی اور دنیوی، سیاسی، مذہبی، معاشی واقتصادی حتیٰ کہ
جہاد اور حکومت تک کے امور سرانجام دیتے رہے ومعہذا شادیاں بھی کیں اور ان کی
اولاد بھی ہوتی رہی بلاشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے تبلیغ بھی کی جہاد بھی
کیا ملکی انتظامات بھی کیے اور چند سالوں میں سرزمین عرب کا نقشہ الٹ کر رکھ دیا
لیکن یہ کہنا کہ آپ کو ازواج مطہراتؓ کے حقوق ادا کرنے کے لیے فرصت نہ
ملتی تھی اور نہ ان میں خواہش پیدا ہوتی تھی سراسر بہتان اور خالص افترا ہے یہ ایک
حقیقت ہے کہ تعدد ازواج کی کئی ایک حکمتیں اور مصلحتیں تھیں وہ ہرگز ازواج
مطہراتؓ کے طبعی اور شرعی حق کے ادا کرنے سے مانع نہ تھیں برقؔ صاحب
کی یہ خود فریبی بھی ملاحظہ کیجیے کہ وہ ۱ھ میں مسجد کی تعمیر اور قبائل سے معاہدوں
کو ازواج مطہراتؓ کے شرعی اور طبعی حقوق ادا کرنے سے مانع ثابت کرتے ہیں
انھوں نے مسجد نبوی کو جو نہایت ہی سادہ صورت میں صرف چند ہی دنوں میں
تیار کر لی گئی تھی کیوں قرطبہ اور غرناطہ کی مسجد یا دمشق کی جامع اموی اور دہلی اور لاہور کی
شاہی مسجد تصور کر لیا ہے اور پھر ان وسیع تر عمارات اور عظیم الشان یادگاروں کے لیے
ایسے اسباب تلاش کرنے شروع کر دیے ہیں جو ان کے لیے ناگزیر تھے وعلیٰ ہذا القیاس
یہود وغیرہ جن قبائل سے معاہدے منظور تھے چند دنوں میں طے کر لیے گئے تھے وہاں
مہینوں کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی تھی چہ جائیکہ سال کی اور برقؔ صاحب
کی یہ تحقیق بھی قابل داد ہے کہ وہ بدر کی لڑائی بھی ۲ھ میں تسلیم کرتے ہیں اور

جنگ اُحد کی بھی حالانکہ بدر ۱۷ رمضان ۲ھ کو اور جنگ اُحد ۱۱ شوال ۳ھ کو ہوئی تھی (ابن کثیر ج ۱ ص ۲۹۹ وغیرہ) اور لکھتے ہیں کہ ۳ھ کو مفتوحہ علاقے کا انتظام الخ نہ معلوم اس سن میں کونسا علاقہ فتح ہوا تھا جس کا انتظام کیا جانا ضروری تھا اور پھر یہ لکھ کر تو حد ہی کر دی ہے کہ فوجوں کی اسلحہ بندی راشن وغیرہ کے انتظامات مجروحین و مقتولین کے متعلق تدابیر۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ برق صاحب کے دماغ میں جنگ عظیم یا جنگ کوریا وغیرہ کا نقشہ سمایا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ جنگ اُحد کی نہایت مختصر اور سادہ لڑائی میں (جس میں طرفین سے بمشکل ایک سو آدمی قتل ہوا ہوگا) موجودہ تباہ کن اور ہولناک جنگوں کے اسباب اور وسائل تلاش کر رہے ہیں۔ برق صاحب ۵ھ میں جنگ بنی مصطلق اور جنگ مریسیع کو دو الگ الگ جنگیں تسلیم کرتے ہیں حالانکہ وہ ایک ہی جنگ تھی بنو مصطلق قبیلہ کا نام تھا اور مریسیع پانی کا چشمہ تھا جس کے آس پاس یہ قبیلہ آباد تھا (سیرت ابن ہشام برحاشیہ زاد المعاد ج ۲ ص ۱۴۵)

برق صاحب کا حدیث پر انتیسواں ۲۹ اعتراض

عن عبد الرحمٰن بن عوف قال سالت عائشۃ ما یوجب الغسل قالت اذا جاوز الختان الختان فقد وجب الغسل (موطا ص ۱۶) عبد الرحمٰن بن عوف کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ کس صورت میں غسل واجب ہو جاتا ہے۔ کہا جب آلہ تناسل کا سر عورت کی شرمگاہ کے ابتدائی حصے میں داخل ہو جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اُس زمانہ میں سینکڑوں صحابہ مدینے میں موجود تھے اور عبد الرحمٰنؓ بن عوف خود بھی فقیہہ صحابہ میں شمار ہوتے تھے اس مضمون پر احادیث بھی لوگوں کو یاد ہوں گی اور پھر انہوں نے یہ کمال کیا کہ ایک نہایت نازک مسئلہ حضور علیہ السلام کی سب سے

کہ عمر زوجۂ مطہرہ سے جا پوچھا کیا مدینہ بھر میں اس چھوٹی سی بات کو کوئی مرد بتانے والا موجود نہیں تھا؟ کیا کوئی غیر مرد کسی معزز خاتون سے اس قسم کی بات دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟ اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ابن عوفؓ یہ غلطی کر بیٹھے تھے تو حضرت عائشہؓ کو چاہیئے تھا کہ اس جسارت پر ڈانٹیں کہ تم کو حرم نبوی سے ایسا عریاں سوال پوچھنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ یا خاموشی اختیار فرمالیتیں یہ آلۂ تناسل کا سر شرمگاہ میں داخل ہونا۔ ایسے ننگے الفاظ میں جو ایک حیادار اور شریف خاتون اپنے شوہر کے سامنے بھی منہ سے نہیں نکال سکتی چہ جائیکہ غیر مردوں کے سامنے (انتھیٰ بقدر الحاجۃ دو اسلام ص ۱۶۴ و ص ۱۶۵ طبع اوّل و ص ۱۷۸ طبع ششم) بیان کو جاری رکھتے ہوئے آگے تحریر فرمایا ہے کہ :۔

میری اس رائے پر حدیث پرست علماء چیخ اٹھیں گے تو کون ہوتا ہے امام مالکؒ کی حدیث کی تردید کرنے والا الخ (ص ۱۶۶ طبع اوّل و ص ۱۷۹ طبع ششم)

جواب :۔ اس سے پہلے کہ ہم پیش کردہ مرکزی سوال کا جواب دیں چند ضروری باتیں عرض کرتے ہیں :۔

۱۔ ابتداء اسلام میں یہ حکم تھا کہ انزال کے بغیر غسل واجب نہیں ہوتا تھا اور بعد کو یہ حکم منسوخ ہوگیا تھا جس کی پوری تفصیل اپنے موقع پر بیان کی جاچکی ہے۔

۲۔ جن بعض صحابہؓ کو نسخ کا علم نہ تھا وہ اسی سابق حکم پر فتویٰ دیتے تھے اور جن کو نسخ کا علم ہوچکا تھا (جو جمہور صحابہؓ تھے) وہ ان کو ایسا فتوے دینے سے منع کرتے تھے اور نوبت بایں جارسید کہ اس مسئلہ پر صحابہ کرامؓ میں کافی لے دے ہوئی اور جن صحابہؓ نے حضور علیہ السلام سے براہ راست نہ پہلا حکم سنا اور نہ دوسرا وہ کافی پریشان تھے اور ہر ایک اس کے لیے بیتاب تھا کہ یہ ایسا اہم مسئلہ ہے جس پر نماز و طواف وغیرہ بڑی بڑی عبادتیں موقوف ہیں اس کو طے کرنا چاہیئے

۳۔ گو جمہور صحابہؓ پہلے حکم کو منسوخ سمجھتے تھے لیکن جن بعض کو نسخ کا علم نہ تھا انہوں نے پہلا حکم براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا تھا اور تاوقتیکہ ان کو کسی معقول دلیل اور روشن ثبوت سے نہ تسلیم کرایا جاتا ان کی تسلّی کیسے ہوسکتی تھی؟ اس لیے ان کی رائے بھی بلا کسی بیّن ثبوت کے نظر انداز کرنے کے قابل نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تسلی اور اطمینان کے لیے اس مسئلہ کو موضوع بحث بنا کر اپنے اختلاف کو نمایاں طور پر بیان کیا تھا۔

۴۔ صحابہ کرامؓ کے اِس اختلاف کو دیکھ کر جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو تسلّی نہ ہوئی تو مجبوراً ان کو حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کرنا پڑا۔

فقال لها لقد شق علیّ اختلاف اصحابِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی امرانی لاعظم ان استقبلكِ بهٖ فقالت ماهو کنت سائلا عنه امك فسلنی عنه الحدیث (مؤطا امام مالک جرا ص۲۵ طبع مصر)	کہ اس معاملہ میں صحابہ کرامؓ کے اختلاف کی وجہ سے میں بہت کافی پریشان ہوں لیکن ساتھ ہی ہمت اور جرأت نہیں پڑتی کہ آپ سے یہ مسئلہ کھل کر بیان کرسکوں حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ جو بات تم اپنی والدہ سے پوچھ سکتے ہو، مجھ سے بھی پوچھ لو (میں بھی آخر تمہاری والدہ کی مانند ہوں)

چونکہ قرآن کریم میں ازواج مطہراتؓ کو مومنوں کی مائیں کہا گیا ہے اس لیے حضرت عائشہؓ کا یہ فرمان بے جا نہ تھا۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰؓ کو جواب سُن کو تسلی ہوئی اور فرمایا مجھے آپ کے بعد کسی اور سے سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے (مؤطا ص۲۵)

۵۔ جب صحابہ کرامؓ کے اختلاف کا یہ عالم تھا تو برق صاحب ہی فرمائیں کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کے قول اور خاص طور پر عمل کے بارے میں وہ کِس سے پوچھتے اور کِس سے سوال کرتے؟ صحابہؓ کا حضرت عائشہؓ سے دریافت کرنا

اس مسئلہ پر گویا آخری فیصلہ کرانا تھا ان کا حضرت صدیقہؓ سے دریافت کرنا اُس لحاظ سے ہرگز نہ تھا جس کو برقؔ صاحب نے کم عمر زوجۂ مطہرہ کا پہلو اختیار کرکے اپنی بدباطنی اور بُری فطرت کا ثبوت دیا ہے، جب یہ فیصلہ صحابہ کرامؓ نے سُن لیا تو سب کو یقین ہوگیا اور جن کو غلط فہمی تھی انہوں نے اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا اور جمہور صحابہؓ کا اس پر عمل، اتفاق اور اجماع ہوگیا بقیہ ازواج کو چھوڑ کر ان سے دریافت کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ازواج مطہراتؓ سے ذہین اور شرعیات میں باخبر تھیں۔ بلکہ بڑے بڑے کبار صحابہؓ جس مسئلہ کو از خود حل نہ کر سکتے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مراجعت فرماتے تھے وہ مسلمہ فقیہ النفس ہونے کی وجہ سے درایۃً یا روایۃً اس کو حل فرما دیتی تھیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا غالب منشا بھی یہی ان کا کامل سمجھ دار ہونا تھا۔ نہ وہ جو برقؔ صاحب کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔

برقؔ صاحب ان روایات کے متعلق کیسا ہی نظریہ کیوں نہ قائم کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی کتنی قربانی اور ایثار ہے کہ امت کی سہولت کے لیے انہوں نے ایسی باتیں نمایاں اور آشکارا کر دی ہیں جن کو شاید کوئی بڑی مہربان اور شفیق ماں بھی بیان نہ کر سکے۔ اِن ضروری امور کے بعد آپ برقؔ صاحب کی پیش کردہ روایت کا جواب سنیئے اصل روایت یوں تھی :۔

عن ابی سلمۃ بن عبد الرحمٰنؓ	عبد الرحمٰنؓ بن عوف کے لڑکے ابو سلمہؒ
بن عوفٍ قال سألت عائشۃؓ	کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے جو
زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہؓ
مایوجب الغسل فقال ھل	تھیں دریافت کیا کہ غسل کس چیز سے
تدری ما مثلک یا اباسلمۃ	واجب ہوتا ہے؟ وہ بولیں اے ابو سلمہؒ
مثل الفرّوج یسمع الدیکۃ	تم جانتے ہو تمہاری کیا مثال ہے؟ تمہاری

تصرخ فیصرخ معہا اذا جاوز الختان الختان فقد وجب الغسل (موطا امام مالک ص۲۵ طبع مصر و موطا امام محمد ص۷۸)

مثال ایسی ہے جیسے چوزۂ مرغ مرغوں کی جماعت کو بانگ دیتا سنے تو وہ بھی ساتھ ہی بانگ دینے لگ پڑے۔ سُن لو اپنے سوال کا جواب جب خاوند کے آلہ تناسل کا سر ختنہ عورت کی شرمگاہ میں داخل ہو تو غسل واجب ہو جاتا ہے

علامہ ابوالولید الباجیؒ (المتوفی ۴۷۴ھ) اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ ابوسلمہؒ نابالغ بچے تھے انہوں نے قبل از وقت ایک ایسا سوال کیا جس کی ان کو ضرورت نہ تھی اور حضرت عائشہؓ نے ڈانٹ کر اس کو چوزۂ مرغ سے تشبیہ دی کہ جوان اور عمر رسیدہ مرغوں کو دیکھ کر وہ بھی ان کے ساتھ بانگ دینے میں شرکت کرتا ہے حالانکہ اس کا ایسا کرنا قبل از وقت ہے (دیکھئے تعلیق المجد ص۷۸) معہذا حضرت عائشہؓ نے اصل مسئلہ بتلا بھی دیا تاکہ ابوسلمہؒ کی مزید دل شکنی نہ ہو اور آئندہ اگر کوئی دینی مسئلہ پوچھنا ہو تو دلیرانہ پوچھ سکیں مزید براں کتمان علم کا گناہ بھی پیش نظر ہو گا بہر حال ابوسلمہؒ کو قدرے تنبیہ کر کے ان کے سوال کا تسلی بخش جواب دے دیا اور یہ بھی یاد رکھیے کہ ابوسلمہؒ حضرت عائشہؓ کے رضاعی بھانجے تھے (حاشیہ بخاری ج۱ ص۳۹) اس تمام بحث کو سامنے رکھتے ہوئے آپ برق صاحب کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ابوسلمہؒ جو سائل تھے ان کو حذف کر دیا اور سائل حضرت[1] عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو قرار دے دیا اور پھر ان کے فقیہ اور غیر محرم ہونے کی گیت شروع کر دی۔ بلاشک وہ عشرہ مبشرہؓ میں سے ایک جلیل القدر اور فقیہ صحابی تھے لیکن سوال انہوں نے نہیں کیا بلکہ ان کے لڑکے ابوسلمہؒ نے کیا تھا۔ اور پھر ان کا دوسرا ظلم اور بے انصافی دیکھئے کہ درمیان کی مخطوطہ عبارت جس میں حضرت عائشہؓ نے ابوسلمہؒ کو تنبیہ کی اور ڈانٹا تھا وہ بالکل حذف

[1] اب طبع ششم میں ابوسلمہؒ ہی لکھا ہے مگر باقی مضمون بدستور وہی ہے۔ ۱۲ ابوالزاہد۔

کردی گویا اس کا حدیث میں کہیں ذکر تک نہیں۔ اور لطف بالائے لطف یا تاسف بالائے تاسف یہ ہے کہ وہ بایں ہمہ یہ لکھتے ہیں کہ علمائے حدیث پرست چیخ اٹھیں گے۔ علماء بیچارے اِس بد دیانتی اور جہالت پر کیوں نہ چیخیں کہ حقیقت سائل ابو سلمہؒ تھا اور برق صاحب نے وہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف بنا دیا اور درمیان کی مخطوطہ عبارت کو شیر مادر سمجھ کر ہضم کر گئے اور رضاعی بھانجے کو غیر محرموں کی صف میں جا کھڑا کیا اور نابالغ بچے کو غیر مرد سے تعبیر کر دیا ہے اور مومنوں کی ماں کو کم عمر زوجہ سے ذکر کیا اور امام مالکؒ کا نام لے کر غلط حوالہ دیا اگر اس جہالت اور خیانت کے پلندہ کو دیکھ کر بھی علماء چیخ نہ اٹھیں تو کیا کریں؟ کیا علماء لوہے اور پتھر کی بے جان مورتیاں ہیں؟ ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
بولیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

برق صاحب کا حدیث پر تینسواں اعتراض

لکھتے ہیں کہ قرآن حکیم کے طول و عرض میں کہیں بھی مذکور نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محشر میں شفاعت کریں گے (دو اسلام ص ۲۸۵) اور پھر آگے لکھتے ہیں۔

اب ذرا محدثین کا نقطۂ نگاہ ملاحظہ کیجیے۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے لوگ حضرت آدم کے پاس جائیں گے اور شفاعت کی التجا کریں گے وہ کہیں گے کہ میں نے تو دانۂ گندم کھا لیا تھا اس لیے اللہ کے سامنے جانے سے ڈرتا ہوں پھر ابراہیمؑ کے پاس جائیں گے وہ کہیں گے۔ کہ میں نے تو تین جھوٹ بولے تھے اس لیے مجھے معاف کرو اس کے بعد موسیٰؑ کے پاس جائیں گے وہ کہیں گے کہ میں نے تو ایک قبطی کو قتل کیا تھا اس لیے خدا کے سامنے جانے کی جرأت نہیں کر سکتا پھر عیسیٰ کے پاس جائیں گے وہ کہیں گے

نفسی نفسی تم محمدؐ کے پاس جاؤ آخر میں لوگ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جائیں گے اور آپ اللہ کے حضور میں روانہ ہو جائیں گے ... الخ (مسلم ج۱ ص۳۷۲)

کیا دلچسپ حدیث تراشی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس ابراہیمؑ سے بھی بڑا بنا دیا جن کی اتباع کا آپ کو بار بار حکم دیا گیا تھا وَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا (تم موحد ابراہیمؑ کے آثارِ قدم پر چلو) اور آپ پر تین جھوٹ بولنے کا بھی الزام لگا دیا اچھا مان لیا کہ آدمؑ نے دانہ کھایا تھا ابراہیمؑ نے جھوٹ بولے تھے موسیٰ نے قتل کیا تھا لیکن حضرت عیسیٰؑ نے کیا قصور کیا تھا کہ انہیں شفاعت کی اجازت نہ مل سکی اور حضرت نوحؑ ادریس، زکریا، ہارون، یونس اور یوسف علیہم السلام میں کیا کمی تھی (انتہیٰ بلفظہ بقدر الحاجۃ دو اسلام ص۲۸۷ و ص۲۸۸) طبع اول ص۲۹۱ و ص۲۹۲ طبع ششم)

جواب:- ہم بلا لحاظ ترتیب عبارت کے برقؔ صاحب کے سوالات کا تجزیہ کرتے ہیں تاکہ آپ کی نگاہ ہر ایک سوال پہ الگ الگ مرکوز رہے اور جوابات کے سمجھنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

۱۔ نوح علیہ السلام میں کیا کمی تھی کہ ان کو شفاعت کے لیے انتخاب نہ کیا گیا؟

۲۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں کیا قصور تھا کہ ان کا ذکر نہ آیا؟ (۳) حضرت ادریس، زکریا، ہارون، یوسف اور یونس علیہم السلام میں کیا کمی تھی کہ ان کا ذکر نہ کیا گیا؟

۴۔ اس حدیث میں حضرت ابراہیمؑ کی طرف تین جھوٹوں کی نسبت کی گئی ہے۔

۵۔ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رتبہ حضرت ابراہیمؑ سے بڑا بیان کیا گیا ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ حضرت ابراہیمؑ سے کم تھا کیونکہ حضور کو حضرت ابراہیم کی اتباع کا حکم دیا گیا تھا اور متبوع تابع سے اعلیٰ اور افضل ہوتا ہے (عیاذاً باللہ)

شق ۱ کا جواب :- بخاری و مسلم وغیرہ میں اسکی تصریح موجود ہے کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد ان کے کہنے کے مطابق جب لوگ حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے تو وہ یہ کہہ کر معذرت کر دیں گے کہ میں نے طوفان کے وقت اپنے بیٹے کے لیے دعا کی تھی جس پہ اللہ تعالیٰ نے ناراضگی کا اظہار کیا تھا اسلیے میں اس کے سامنے پیش ہونے سے معذور ہوں (مشکوٰۃ ص ۴۸۹ ج ۲ وقال متفق علیہ)

شق ۲ کا جواب :- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معذرت اگرچہ برق صاحب کو نہیں ملی تو اس کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہیں کہ احادیث میں اس کا ثبوت موجود نہیں ہے، احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے (نصاریٰ نے میری (اور میری والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہا السلام کی) عبادت کی تھی اور ہمیں اللہ بنا کر ہم پر افترا باندھا تھا اور مجھے اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنا لیا تھا اس لیے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے سے معذرت خواہ ہوں چنانچہ انکے بعض الفاظ یہ ہیں کہ اِنّی عُبِدتُ من دون اللّٰہ (ترمذی وغیرہ ص ۱۴۳ ج ۲) میری اللہ تعالیٰ کے ورے عبادت کی گئی تھی اگرچہ اسمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی قصور نہیں لیکن پھر بھی دوسروں کی طرف سے جو ایک غلط نسبت انکی طرف ہوئی ہے اس کے پیش نظر کہ (میری وجہ سے لوگوں نے مالک الملک کی عظمت اور توحید کا انکار کیا) اللہ تعالیٰ کے دربار میں شفاعت کے لیے کھڑا ہونے سے اظہار معذرت کریں گے۔

شق نمبر ۳ کا جواب :- اولوا العزم پیغمبر صرف پانچ ہیں حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ علیہم الصلوات والتسلیمات چنانچہ قرآن کریم سورۃ احزاب کے پہلے رکوع اور سورۃ شوریٰ کے دوسرے رکوع میں اس کا ذکر موجود ہے اور میدان محشر میں یہی اولوا العزم پیغمبر ہوں گے جو اپنی اپنی جگہ عذر کریں گے ہاں صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مجمع الصفات ہی اس شفاعت کبریٰ کے منصب کی اہل ہوگی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ باقی چاروں اولوا العزم پیغمبر معذرت کریں گے تو دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر ہی کیا ہے جو ان کے رتبہ کو نہیں پہنچتے چونکہ حضرت آدم علیہ السلام نسل انسانی کے باپ ابوالبشر تھے اور عالم اسباب میں جنت سے نکلنے اور

مصائب اور تکالیف میں مبتلا کرانے کا ظاہری ذریعہ حضرت آدم علیہ السلام ہی ہیں اس لیے سب سے پہلے لوگ ان کی خدمت اقدس میں حاضر ہوں گے کہ شاید وہی تعجیلِ حساب کا کوئی کار آمد اور مفید گُر بتلا دیں مگر وہ اپنی لغزش کو پیش کرتے ہوئے معذرت کر دیں گے تو آدم علیہ السلام سے محض ابوالبشر ہونے کے لحاظ سے اور باقی حضرات سے اولوالعزم ہونے کے اعتبار سے درخواست ہوگی۔

شق نمبر ۲ کا جواب :- ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ہر لفظ کو ہر ایک مقام پر چسپاں نہیں کیا جا سکتا بلکہ موقع اور محل کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ دیکھیے قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفت بھی سمیع اور بصیر آئی ہے اور انسان کی بھی مگر خدا تعالیٰ کے لیے سمع اور بصر کا وہ معنیٰ مناسب ہوگا جو اس کی شان کے لائق ہے اور انسان کے لیے وہ معنیٰ جو اس کے حال کے لیے لائق ہوگا یا مثلاً حفیظ اور علیم خدا کی صفت بھی ہے اور تیرھویں پارہ کے ابتدا میں حضرت یوسف علیہ السلام کی بھی یہی صفت بیان ہوئی ہے یا مثلاً خدا کی صفت بھی رؤف اور رحیم ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی سورۂ توبہ کے آخر میں یہ صفت آئی ہے تو کیا ان تمام مواقع پر جو معنیٰ خدا کے لیے (کہ ذاتی اور قدیم وغیرہ ہو) مناسب اور اس کی شایانِ شان تھا وہی حضرت یوسف علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی جائز ہوگا؟ قرآن کریم میں ظلم کا لفظ دیگر معاصی پر بھی اور خاص کر شرک پر بھی بولا گیا ہے۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (کہ بے شک شرک بڑا ظلم ہے) تو کیا یہی معنیٰ حضرت آدمؑ اور حواؑ کے لیے (جو رَبَّنَا ظَلَمْنَا الآیۃ میں بیان ہوا ہے) اور حضرت یونسؑ کے لیے (جو اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ میں بیان ہوا ہے) مراد ہوگی؟ ظن کا لفظ قرآن میں گمان اور وہم کے لیے بھی آتا ہے اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا کہ وہم اور گمان حق کے بارے میں کسی طرح کفایت نہیں کر

سکتا) اور ظن کا معنی یقین بھی ہے مومنوں کی صفت میں ارشاد ہوتا ہے کہ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلَاقُوْا رَبِّهِمْ۔ ان کو یقین ہے کہ ایک دن اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ ذنب کے معنی عربی میں گناہ کے ہوتے ہیں (جس کی جمع ذنوب ہے) اس کا اطلاق شرک جیسے قبیح گناہ سے لے کر ایک معمولی گناہ پر کیا گیا ہے اور اس کا اطلاق کافروں اور مشرکوں کے گناہوں پر بھی ہوا ہے اور مسلمانوں کے گناہوں پر بھی اور یہی لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی استعمال ہوا ہے وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ اے نبی اپنے گناہ سے معافی مانگیے اور ارشاد ہوتا ہے۔ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے اور پچھلے تمام گناہ معاف کر دے۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ذنب (گناہ) کا وہی معنی ہوگا جو ایک مشرک، قاتل، زانی، شرابی اور جوئے باز کے لیے ہوگا؟ حاشا وکلا کہ کسی مسلمان کے ذہن میں اس کا وہم بھی پیدا ہوتا ہو سبھی جانتے ہیں کہ آپ کی بلند شان کے مناسب ذنب سے وہ مباح اور جائز باتیں مراد ہیں جو آپ سے صادر ہوئیں (مثلاً کسی غریب صحابی کو مجلس سے کسی مصلحت کے پیش نظر اٹھانے کا ارادہ کر لینا یا کسی غریب اور اندھے اور معذور صحابی کی طرف کسی اہم اور ضروری مصلحت کی وجہ سے توجہ نہ کرنا وغیرہ وغیرہ) اور وہی آپ کے حق میں بقول ئے

ع نزدیکاں را بیش بود حیرانی، ذنب اور گناہ قرار پائیں اگر کسی غیر معصوم سے ایسے امور صادر ہوتے تو شاید اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع کے پیش نظر وہ درخور اعتناء نہ سمجھے جاتے اور وہ گناہوں کی گٹھڑیوں سے یہ کہتا ہوا صحیح و سالم گذر جاتا کہ ع

نگاہ لطف کے امید وار ہم بھی ہیں

دوسرے مواقع تو چھوڑیئے برق صاحب اور ان کے ہمنوا جو حدیث کا انکار محض اس لیے کرتے ہیں کہ وہ پابندی کی زندگی کسی طرح بسر نہیں کر سکتے

اور احادیث کو مان کر صورت، سیرت، گفتار، کردار، اخلاق اور ہر قسم کے معاملات میں پابہ زنجیر ہو کر رہنا پڑتا ہے اور سادہ لوح مسلمانوں کو دامِ تزویر میں پھنسانے کے لیے وہ ایسی احادیث تلاش کرتے ہیں جن میں سرمو بھی کوئی چیز انبیاء عظام علیہم السلام کے متعلق مخدوش نظر آتی ہو ان کو پیش کر کے احادیث کے انکار کا بمقتضائے ع خوئے بدرا بہانہ ہائے بسیار ایک بہانہ بنا لیتے ہیں ہمیں ذرا ٹھنڈے دل سے یہ سمجھا دیں کہ حضرت آدم اور حضرت یونس علیہما السلام کی طرف قرآن کریم میں جو ظلم کی نسبت ہوئی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو ذنب کی نسبت ہوئی ہے کیا وہ قرآن کریم کی ان آیات کا انکار کرتے ہیں یا اقرار؟ اگر انکار کرتے ہیں تو صرف حدیث ہی کے انکار کا چرچا کیوں کیا جاتا ہے قرآن کریم کا بھی صاف انکار کر دیا جائے اور پھر جیسے دل چاہے زندگی اختیار کر لی جائے اور تمام مصیبتوں سے جان چھوٹ جائے نہ رہے بانس نہ بجے بانسری اور اگر وہ ان آیات کا انکار نہیں کرتے بلکہ ظلم اور ذنب کا کوئی مناسب معنی لے کر بیان کرتے ہیں تو اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت جو حدیث میں ثلاث کذبات تین تعریضیں بیان ہوئی ہیں ان کو بھی کسی احسن محل پر حمل کیا جائے۔ لغت میں کذب کے متعدد معانی آتے ہیں جھوٹ بولنا، غلطی کرنا واجب ہونا، چوٹ کرنا طنزیہ طور پر کچھ کہنا۔ توریہ کرنا وغیرہ

ل برقی صاحب کی پسند کا جواب ملاحظہ ہو۔ ان کی غیر محرف بائیبل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد درج ہے کہ اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے (رومیوں باب ۳ آیت ۷) اگر ایسے ہی صورۃً کذب سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان مبارک سے حقانیت ظاہر ہوتی ہو تو اس میں کیا خرابی ہے؟

وغیرہ دیکھئے صراح ص۵۱ وغیرہ کتب۔ لغت) طنز یہ طور پر جو کلام کیا جائے یا تعریض کی جائے کلام کرنے والا عموماً اور اکثر حالات میں ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جو صورت میں واقع کے خلاف ہوتا ہے اگرچہ حقیقت اور اس کی مراد میں ایسا نہ ہو حضرت ابراہیمؑ کا حضرت سارہؒ کو بہن کہنا اور اِنِّی سَقِیْمٌ یا۔ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا۔ یہ سب صورتاً کذب ہیں نہ کہ حقیقۃً و مراداً لیکن چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شان بہت اونچی ہوتی ہے اس لیے وہ صورتِ کذب سے بھی انتہائی نفرت کرتے ہیں اسی وجہ سے قیامت کے دن حضرت ابراہیمؑ درگاہ خداوندی میں حاضری سے معذرت چاہیں گے علاوہ بریں حافظ قسطلانیؒ لکھتے ہیں کہ جب قرآن کریم میں اِنِّی سَقِیْمٌ اور بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا (کہ جب لوگوں نے حضرت ابراہیمؑ سے دریافت کیا کہ ان بتوں کو کس نے توڑا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ان کے بڑے نے کیا ہوگا حالانکہ کیا خود تھا) مذکور ہے تو حدیث سے انکار کر لینے سے کیا فائدہ ہوگا؟ (شرح بخاری ج ۵ ص۲۸۰) بہرحال جو مطلب برقؔ صاحب اور ان کے ہمنوا قرآن کریم کی ان آیات کا بیان کریں گے وہی ہماری طرف سے حدیث کا سمجھ لیں ورنہ صرف حدیث کا انکار ان کو چنداں سودمند نہ ہوگا کیوں کہ قرآن و حدیث کا تعلق نہایت گہرا اور پائدار ہے اور حدیث پر اعتراض صرف حدیث پر ہی نہیں بلکہ قرآن پر بھی ہے کیونکہ قرآن و حدیث کا رشتہ بڑا مضبوط اور رابطہ بہت مستحکم ہے ؎

تا دامن آکے چاکِ گریباں لے دم لیا ہے دامن اور جیب میں رشتہ قریب کا

شق نمبر ۵ کا جواب:۔ تمام مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رتبہ اور درجہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بڑھ کر ہے حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی آپ کا رتبہ بڑھ کر ہے اور آپ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام

کا رتبہ ہے (دیکھئے شرح فقہ اکبر ص۴ وغیرہ) تفصیل کی تو گنجائش نہیں البتہ اجمالاً اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوّت قوم اور زمانہ کے لحاظ سے محدود تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور نبوت تمام انسانوں بلکہ ثقلین (جن و انس) بلکہ تمام عالمین کے لیے عام ہے اور آپ کے مبعوث ہونے کے بعد قیامت تک آپ ہی کی نبوّت ہوگی آپ کے بعد کسی کو نبوّت نہیں مل سکتی جو آپ کے بعد نبوت یا رسالت کا دعوےٰ کرے گا وہ کذاب دجال اور مفتری ہوگا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی جب آسمان سے نازل ہوں گے تو صرف آپ کی شریعت پر عمل کریں گے کسی کو اپنے رسول اور نبی ماننے کی دعوت نہیں دیں گے بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک وفادار جرنیل کی حیثیت سے اتباع کریں گے۔ اور قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اس مضمون کا اعلان کرایا گیا ہے کہ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا فرما دیجئے اے انسانوں میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اسی طرح كَافَّةً لِلنَّاسِ اور رَحْمَةً لِلْعٰلَمِيْنَ اور لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا وغیرہا آیات اس امر کو نہایت وضاحت سے بیان کرتی ہیں۔ اب برق صاحب ہی فرمائیں کہ کیا جن کی نبوّت تمام انسانوں اور جنوں بلکہ تمام مخلوق کے لیے ہو اور زمانہ بھی محدود نہ ہو (کہ اُن کے بعد کوئی اور نبی مبعوث ہو کر اگرچہ بعض ہی احکام کیوں نہ ہو منسوخ کر سکے) وہ افضل ہوں گے یا وہ جن کی نبوّت باعتبار قوم اور زمانے کے محدود اور مخصوص ہو؟ دیکھئے کیا ارشاد ہوتا ہے ؎

الٹی سمجھ کسی کو بھی ایسی خدا نہ دے
دے آدمی کو موت پر یہ بد ادا نہ دے

یہ بھی مت بھولیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو حضرت ابراہیمؑ کی اتباع کا حکم نہیں دیا گیا تاکہ کلی طور پر اُن کا افضل ہونا ثابت ہو بلکہ آپ کو ملتِ ابراہیمی کے

اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور ملت ابراہیمی سے آسمانی مذہب مراد ہے جس میں توحید رسالت معاد اور دیگر تمام اصولی اور بنیادی باتیں آجاتی ہیں۔ رہا یہ سوال کہ حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ اور دیگر انبیاء عظام علیہم السلام بھی تو آخر آسمانی مذہب کے پابند اور قائل تھے آسمانی مذہب سے صرف حضرت ابراہیمؑ ہی کی کیا خصوصیت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کو اگر یہود تسلیم کرتے تھے تو نصاریٰ ان کا انکار کرتے تھے اور حضرت عیسیٰ کو یہود تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے عرب کے مشرک اور مجوی وغیرہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی نبوت اور بزرگی کے قائل نہ تھے البتہ بزرگ ہستی جن کے متعلق یہود نصاریٰ مجوس اور مشرکین عرب کا اپنی اپنی جگہ حسن ظن اور دعوے تھا کہ وہ ہستی بلاشبہ بزرگ ترین ہستی ہے وہ صرف ابراہیم علیہ السلام ہی تھے ہر ایک کا یہ دعوے تھا کہ ہم ہی ابراہیمی ہیں یہود نصاریٰ اور مشرکین کے اس دعوے کو قرآن کریم نے پیش کر کے عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں اس باطل اور بے بنیاد دعوے کی دھجیاں فضائے آسمانی پر اڑائی ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ درحقیقت حضرت ابراہیمؑ کے طریق کار اور ملت حنیفی (جس کا دوسرے الفاظ میں نام توحید خالص ہے) پر چلنے والے ہمارے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے پیروکار ہیں باقی ملت ابراہیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا تعالیٰ کی طرف سے جدید اور مستقل شریعت عطا نہ ہوئی تھی اور آپ فروع اور جزئیات میں بلکہ من وعن حضرت ابراہیمؑ کی تابع تھے جیسا کہ برق صاحب کو یہ کھلا دھوکہ ہوا ہے۔ برق صاحب کا استدلال ملاحظہ کیجیے وہ لکھتے ہیں کہ وَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا۔ تم موحد ابراہیم کے آثار قدم پر چلو (دو اسلام ص ۲۸۸) یہ آیت دراصل یہود کے بارے میں ہے دیکھئے چوتھے پارے کی ابتدائی آیات۔ مگر حیرت ہے کہ برق صاحب اس کا مصداق موحد بیان کرتے ہیں اور پھر خانہ ساز موحدین کی اس پوری جماعت کا مصداق خاص طور پر

پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بتلاتے ہیں یہ ہے برق صاحب کی قرآن دانی اور تفسیری نکتہ ع

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے متعلق قرآن کریم کی مطابقی دلیل آیت ہے ثُمَّ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (پ۱۴) سورہ نمل، رکوع ۱۶) پھر ہم نے آپ کی طرف حکم بھیجا کہ آپ ملّت ابراہیم کی اتباع کریں جو اللہ کی طرف یکسو ہونے والے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

برق صاحب سے ایک سوال۔

جہاں تک برق صاحب کے پیش کردہ سوالات کے جوابات تھے وہ عرض کر دیئے گئے ہیں یہاں ہم اُن سے ایک سوال کرتے ہیں وہ یہ کہ قرآن کریم میں پچیس[۲۵] پیغمبروں کے نام بیان کئے گئے ہیں جن میں سے اٹھارہ حضرات کے نام ایک ہی رکوع میں بیان کئے گئے ہیں جو یہ ہیں۔ حضرت نوح[۱] حضرت ابراہیم[۲] حضرت اسحاق[۳]، حضرت یعقوب[۴] حضرت داؤد[۵] حضرت سلیمان[۶] حضرت ایوب[۷] حضرت یوسف[۸]، حضرت موسیٰ[۹]، حضرت ہارون[۱۰]، حضرت زکریا[۱۱]، حضرت یحییٰ[۱۲] حضرت عیسیٰ[۱۳] حضرت الیاس[۱۴] حضرت اسمعیل[۱۵]، حضرت الیسع[۱۶] حضرت یونس[۱۷] اور حضرت لوط[۱۸]۔ علی نبیّنا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے۔ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ (پ۷، سورۃ انعام رکوع ۱۰) اور ان کے آباء میں سے بعض کو اور ان کی اولاد اور بھائیوں میں سے بعض کو ہم نے رسول اور نبی بنایا گویا تفصیلی اور اجمالی طور پر تمام انبیاء عظام کا ذکر اس میں آگیا آگے ارشاد ہوتا ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی تھی پس اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

آپ ان کی ہدایت کی اقتدار اور پیروی کیجیے اگر برق صاحب کی نرالی اور انوکھی منطق کو پیش نظر رکھا جائے تو لازم آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رتبہ اور درجہ صرف حضرت ابراہیمؑ سے ہی کم نہیں بلکہ تمام پیغمبروں سے کم ہو کیونکہ آپ کو ان تمام کی ہدایات کی اتباع کا حکم ہے (العیاذ باللہ) حالانکہ جملہ مسلمان جانتے ہیں کہ آپ کا درجہ علی الاطلاق تمام پیغمبروں سے زیادہ ہے اور آپ کو ان انبیاؑ کی اتباع کا حکم نہیں کیا گیا بلکہ اُس ہدایت کی اتباع کا حکم کیا گیا ہے جو سب کو منجانب اللہ عطا ہوئی تھی۔ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ۔ برق صاحب کو علماء سے یہ شکایت ہے کہ وہ قرآن کے رموز اور اسرار پر غور نہیں کرتے اور خود اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ میری آنکھیں کھُل گئیں اندھی تقلید کی وہ تاریک گھٹائیں جو دماغی ماحول پہ محیط تھیں یک بیک چھٹنے لگیں (دو اسلام ص۱۹) بھلا برق صاحب کی اس تحقیق انیق اور تدقیق عمیق کے مقابلہ میں مُلّا بیچارہ کیا کر سکتا ہے کیا خوب ؟ ؎

میں لایا ہوں پکڑ کر شیرِ تحقیق تم اپنے فیل معنی کو نکالو

مگر برق صاحب کی بلا سے وہ تو اس بات پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم تمام پیغمبروں کو (جن میں ان کے خیال کے مطابق محمد کرشن، بدھ، زرتشت اور کنفوشش وغیرہ بھی نبی اور رسول ہیں) ہر لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم مرتبہ تسلیم کریں یہ بھی جانے دیجیے وہ تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ نجات اخروی کے لیے سرے سے پیغمبروں پر ایمان لانا بھی ضروری نہیں ہے۔ مقدمہ میں برق صاحب کی کتاب ایک اسلام کے ضروری اقتباسات ہدیہ ناظرین کر دیے گئے ہیں یہاں ایک مصیبت تو نہیں مصائب شتّٰی ہیں ؏

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

برق صاحب کا حدیث پر اکتیسواں اعتراض

کیا رسول اللہ نے اللہ کو دیکھا تھا۔ ابو ذرؓ نے حضور سے پوچھا کیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے؟ فرمایا ہاں میں نے دیکھا وہ ایک نور ہے (مسلم ج ۱ ص ۲۴۱) لیکن یہی ابو ذرؓ ساتھ والی حدیث میں کہتے ہیں: میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کو آپ نے دیکھا تھا فرمایا هُوَ نُورٌ اَنّٰی اَراہ وہ نور ہے میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں یعنی ایک حدیث میں دیکھنے کی نفی ہے اور دوسری میں اثبات انتہیٰ بلفظہٖ (دو اسلام ص ۳۱۹ طبع اوّل اوراب ندارد)

جواب:- اس مسئلہ کے یہ پہلو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو معراج کی رات دیکھا تھا یا نہیں؟ ظاہری آنکھوں سے دیکھا تھا یا دل کی بصیرت سے؟ ایک مرتبہ دیکھا تھا یا دو مرتبہ؟ حضرت عائشہؓ اور ابن مسعودؓ اس کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے اور ابن عباسؓ کا کیا خیال تھا؟ اور ہر ایک کے پاس دلائل کیا ہیں؟ یہ سب امور ہماری بحث سے خارج ہیں ہم تو صرف برق صاحب کے سوال کا جواب عرض کریں گے۔ انہوں نے اس سوال میں جہالت اور غفلت دونوں کا ثبوت دیا ہے۔ اور عربی کی عبارت کے نقل کرنے اور اس کے معنیٰ دونوں میں انتہائی خیانت کی ہے اب آپ اصل عبارت اور اس کا ترجمہ ملاحظہ کریں۔

عن ابی ذرؓ قال سالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھل رأیت ربک؟ قال رأیت نوراً (جلد ۱ ص ۹۹ مسلم و ابو عوانہ جلد ۱ ص ۱۴۷ و ابن کثیر جلد ۴ ص ۲۵۰)

حضرت ابو ذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا کہ میں نے نور دیکھا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت سے کوئی جواب نہیں دیا نہ نفی میں نہ اثبات میں آپؐ نے فقط یہی فرمایا کہ میں نے صرف نور دیکھا ہے لیکن برق صاحب معنیٰ یوں کرتے ہیں۔ ہاں میں نے دیکھا وہ ایک نور ہے گویا ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

اللہ تعالیٰ کی ذات کو دیکھا اور وہ ذات نور تھی حالانکہ حدیث کا نہ یہ مطلب ہے اور نہ منشاء ، دوسری روایت حضرت ابوذرؓ سے یوں مروی ہے عن ابی ذرؓ قال سالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہل رأیت ربک ؟ قال نورانی اراہ (مسلم ج ۱ ص ۹۹ وابن کثیر ج ۴ ص ۲۵۰ وغیرہ) حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے ؟ آپ نے فرمایا میں نے تو نور دیکھا ہے میں اللہ کو کب دیکھ سکتا ہوں اس دوسری روایت سے صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اللہ تعالیٰ کی ذات کے دیکھنے کی سختی سے نفی کی ہے اور نور کے دیکھنے کا اثبات فرمایا ہے ۔ عربی کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ کبھی مبتدا کو حذف کر دیا جاتا ہے اور کبھی خبر کو اور جواب میں جب مبتدا حذف ہو تو سوال اس کا صریح قرینہ ہوتا ہے نورٌ خبر ہے اور اس کا مبتدا محذوف ہے جو سوال کے قرینہ سے الذی رایتہ ۔ نورٌ ہوگا کیونکہ سوال میں ہل رأیت اس کا صاف قرینہ ہے ۔ اور اس کے ذکر کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں پڑتی مضمون کلام سے سب اس کو سمجھ سکتے ہیں مگر اِلّا یہ کہ کسی مبتدی کو سمجھانا ملحوظ ہو تو اس کو ذکر بھی کر دیا جاتا ہے ۔ برقؔ صاحب نے اپنی مرضی اور خواہش سے بلا کسی دلیل اور قرینہ کے ھُوَ کا اضافہ کیا اور عبارت ھُوَ نُورٌ انّٰی اراہ بنا کر یہ مغالطہ اور دھوکہ دینے کی کوشش کی کہ ھُوَ بھی حدیث کے اندر موجود اور مذکور ہے پہلی حدیث میں معنی بدل ڈالا تھا اور اس میں پہلے لفظ ھو اپنی طرف سے ڈال کر عبارت بدلی پھر اس کا معنی بدل کر حدیث پر اعتراض کر دیا اور بیک وقت اپنی جہالت اور خیانت دونوں کا ثبوت بہم پہنچایا نعوذ باللہ من سُوء الفہم اگر وہ ذرہ برابر بھی اپنے دماغ پر بوجھ ڈالتے یا کتابوں اور اہل علم کی طرف مراجعت کرنے اور ہمت و انصاف کو ہاتھ سے نہ چھوڑتے تو لا محالہ وہ اس اشکال کو خود دبیا (مفقود) ”

پاتے کیونکہ خالق فطرت نے سمجھ اور ہدایت کا دروازہ کسی پر بند نہیں کیا ہے۔ اِلّا یہ کہ کوئی خود ہی کوتاہ ہمت ہو ؎

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

برق صاحب کا حدیث پر بتیسواں[۳۲] اعتراض

لکھتے ہیں کہ ایک اور حدیث دیکھئے۔ حذیفہؓ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کھاد کے ایک ڈھیر کے قریب آئے اور میرے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا (بخاری ج ۱ ص ۳۶) اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے دو دو مرتبہ دھرایا ہے (پھر آگے لکھتے ہیں کہ) امام بخاری ہی میں یہ جراٰت تھی کہ اس معلم کائنات و مہبط الوحی کی طرف یہ فعل منسوب کر دیا ورنہ ہم تو حضور کے متعلق اس قسم کی کوئی بات خیال تک میں لانا گناہ سمجھتے ہیں (دو اسلام ص ۳۳۴ طبع اوّل اور طبع ششم ص ۳۳۲ لیکن اس میں سامنے کھڑے ہو کر کے الفاظ اور امام بخاری میں یہ جراٰت تھی الخ سطر اڑا دی ہے)

جواب :۔ برق صاحب نے یہ بتلانے کی ناکام کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہؓ کے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کیا تھا اور گویا حضرت حذیفہؓ کھاد کے ڈھیر کے اُوپر بیٹھے ہوئے تھے حالانکہ وہ فرماتے ہیں کہ میں آپ کی پیٹھ کے پیچھے کھڑا تھا (بخاری ج ۱ ص ۳۶) حدیث کے بعض اصل الفاظ یہ ہیں۔

اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم سباطۃ قوم فبال قائماً

(متفق علیہ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۴۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم کے کھاد کے ایک ڈھیر کے پاس آئے اور کھڑے ہو کر آپ نے پیشاب کیا۔

اس روایت میں کوئی جملہ اور لفظ ایسا نہیں ہے جس کا معنیٰ میرے سامنے کے ہوں لیکن برق صاحب ہیں کہ حدیث کے مضمون کو بدنما بنانے کے لیے اپنی

طرف سے میرے سامنے کے الفاظ کا اضافہ کر کے حدیث پڑھنے کی بے جا سعی کر رہے ہیں بات دراصل یوں تھی کہ بال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قائما من جرح کان بما بضہ (الحاکم ج ۱ ص ۱۸۲ والبیہقی ج ۱ ص ۱۰۱) کہ حضور علیہ السلام کے گھٹنے میں زخم تھا۔ اس لیے آپ بیٹھ نہ سکے اور اس مجبوری کی وجہ سے کھڑے ہو کر پیشاب کیا اس معقول عذر کے ساتھ عین ممکن ہے کہ وہاں بیٹھ کر پیشاب کرنے کی جگہ بھی نہ ہو اور بیٹھ کر پیشاب کرنے سے کپڑے پلید ہو جانے کا خطرہ بھی ہو۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بشر اور انسان تھے اور آپ کا انسانی امراض و عوارض سے دوچار ہو جانا بعید نہ تھا اور یہ واقعہ بھی زندگی بھر میں صرف ایک مرتبہ پیش آیا تھا اگر یہ اعذار نہ ہوتے تو یقیناً معلم کائنات اور مہبط الوحی اس فعل کو ہرگز کبھی بھی گوارا نہ فرماتے چونکہ آپ صدق مجسم تھے وہی کچھ کرتے تھے جو کہتے تھے کیونکہ ؎

نمی باشد مخالف قول و فعل راستاں باہم
کہ رفتار قلم باشد ز گفتار قلم پیدا

برق صاحب کا حدیث پر تینتیسواں ۳۳ اعتراض

ایک مختصر سی تمہید کے بعد لکھتے ہیں کہ لیکن جو پیش گوئی بخاری میں موجود ہے وہ ہماری اس تمنا کو (جب حضور علیہ السلام نے قیصر اور کسریٰ کو اسلام کے دعوت نامے بھیجے تو قیصر نے آپ کے بھیجے ہوئے قاصد کی بڑی تعظیم کی مگر کسریٰ نے دعوت نامہ پھاڑ دیا اور قاصد کی توہین کی مناسب تو یہ تھا کہ آپ قیصر کے ساتھ اسی طرح محبت کرتے جس طرح آپ نے نجاشیؓ کے ساتھ کی تھی اور کسریٰ کی بدتمیزی پر اس کے خاتمہ کی پیش گوئی فرماتے لیکن آپ نے قیصر و کسریٰ دونوں کی تباہی اور خاتمہ کی پیش گوئی فرمائی ہے یہ برق صاحب کی تمنا کا خلاصہ ہے جو خود انہوں نے دو اسلام طبع اول ص ۱۷۷ و ص ۱۹۱ طبع ششم میں تحریر فرمائی ہے) پورا نہیں کرتی

عن ابی ھریرۃؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہٗ واذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہٗ ۔ ابوہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کسریٰ کے تباہ ہونے کے بعد کوئی اور کسریٰ نہیں ہوگا اور نہ قیصر کے بعد کوئی اور قیصر۔

کسریٰ کے متعلق یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی رحلت کے صرف دس برس کے بعد ۶۴۲ء میں جنگ نہاوند نے ساسانی خاندان کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا کسریٰ (یزدگرد) قتل ہوگیا اور اس کے بعد آج تک پھر کوئی کسریٰ پیدا نہ ہوا۔ چاہیے تو تھا کہ قیصر کے متعلق بھی یہ پیش گوئی پوری ہوتی لیکن اے کاش کہ ایسا نہ ہوا (چند سطور کے بعد برق صاحب یوں تحریر فرماتے ہیں کہ) یہاں تک کہ سلطان محمد ثانی (۱۴۵۱ء۔ ۱۴۸۱ء) فاتح قسطنطنیہ نے اس سلسلہ کو ۱۴۵۳ء میں ختم کیا حضور نے یہ پیش گوئی ۶۳۰ء میں کی تھی اور یہ خاندان اس پیش گوئی کے بعد آٹھ سو تیئس برس تک زندہ رہا (دو اسلام ص۱۷۸ بلفظہٖ طبع اوّل و ص۱۹۱ طبع ششم) اور پھر جوشِ تحریر میں آکر اور ہوش و خرد کو جواب دے کر یوں رقمطراز ہیں کہ :۔

ایک پیشگوئی سوا آٹھ سو برس تک پوری نہ ہو اور ہم یہی کہے جائیں کہ وحی خفی ہے مخبر صادق کا قول ہے خدائی الہام ہے اس پر ایمان لاؤ ، مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ اس طرح کی پیشگوئی تو ہر شخص کر سکتا ہے۔ (دو اسلام ص۱۷۹ طبع اوّل و ص۱۹۲ طبع ششم)

جواب :۔ اگرچہ برق صاحب سطحی طور پر صرف ایک طویل المیعاد پیشگوئی پہ برس رہے ہیں لیکن اس کی تہ میں بہت کچھ ہے اور بہت ممکن ہے کہ بعض حضرات کو اس برقی منطق کے پیش نظر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور اور دجال ، یاجوج وماجوج اور دابۃ الارض کے خروج نیز اسی قسم کی بیشمار پیشگوئیوں کے بارے میں تردد اور وہم پیدا ہو جائے جن کا ثبوت قرآن کریم احادیث

متواترہ اور اجماع امت سے ہے اور جو ایک طے شدہ حقیقت ہے اس لیے ہم اس کو قدرے تفصیل سے عرض کرتے ہیں۔

اس بات میں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو بھی شک و شبہ نہیں ہو سکتا کہ پیشگوئی کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی چیز کے قائم اور جہان میں واقع ہونے سے قبل اس کے وقوع کی صحیح خبر دی جائے عام اس سے کہ وہ خبر خوشی سے تعلق رکھتی ہو یا غمی سے۔ مسرت اور اقبال کے دلربا نغمے سناتی ہو یا موت و ادبار کے عبرت آموز اور دل خراش نعرے۔ فتح و کامرانی کے شادیانے بجنے کی بشارت دیتی ہو یا مقہوریت اور شکست کے موثر مناظر اور آہ و بکا کی صدائیں پیش کرتی ہو۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے، جس کا انکار کوئی معقول اور عقلمند انسان کبھی نہیں کر سکتا اور اگر پیش گوئی کے لیے کوئی خاص وقت بیان نہ کیا گیا ہو تو جب بھی اس کا ظہور ہوگا وہ پیشگوئی ہی سمجھی جائے گی دیکھئے اللہ تعالیٰ نے جب سے دنیا کو پیدا کیا ہے اسی وقت سے خیر و شر اور جزا و سزا کا خمیازہ بھگتنے کے لیے ایک سرکاری عدالت (قیامت) کے قائم کرنے کی خبر دی ہے ہر ایک رسول اور نبی نے معاد اور آخرت پر یقین رکھتے ہوئے اپنی اپنی امت کو اس پر ایمان لانے اور یقین کرنے کی دعوت دی ہے اور اس کا عقیدہ رکھنا جزو ایمان قرار دیا ہے اور قرآن کریم میں بھی یہ مذکور ہے اور اس کا برق صاحب کو بھی اقرار ہے مگر ابھی تک قیامت نہیں آئی ہزاروں سال گذر چکے ہیں کیا برق صاحب کی خود ساختہ منطق کے رُو سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ چونکہ ابھی تک قیامت نہیں آئی۔ لہٰذا یہ خبر اور پیشگوئی جھوٹی ہے؟ (العیاذ باللہ) یا دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یاجوج اور ماجوج کے ظہور اور خروج کی خبر دی ہے کہ وہ سطح زمین پر پھیل کر (قتل و غارت اور) فتنہ و فساد برپا کریں گے اور نص قرآنی اس بات کو واشگاف کرتی ہے کہ حضرت ذوالقرنین نے (جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاصر تھے اور

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ برقؔ صاحب کی تحقیق کے رُو سے ۲۱۶۲ قبل مسیح تھا دو اسلام طبع اول ص۱۸۲ و ص۱۹۵ طبع ششم گویا اس وقت تک ان کو ۴۲۲۵ سال گذر چکے ہیں) ایک خاص قوت کے تحت یاجوج ماجوج کو باقی دنیا سے الگ کر دیا تھا مگر ابھی تک پیشں گوئی پوری نہیں ہوئی اور یاجوج و ماجوج کا خروج نہیں ہوا جیسا کہ جملہ اہل اسلام کا عقیدہ ہے اور شاید برقؔ صاحب کا بھی یہی عقیدہ ہو۔ اب برقؔ صاحب ہی فرمائیں کہ ہم اس قرآنی پیشگوئی کے متعلق کیا نظریہ رکھیں اور اس وحی جلی کے حق میں کیا کہیں ؟ ممکن ہے برقؔ صاحب یہ ارشاد فرمائیں کہ یاجوج و ماجوج سے وہ مخلوق اور قوم مراد نہیں ہے جس کا نسلاً بعد نسلٍ مسلمان انتظار کرتے چلے آرہے ہیں اور یہ چیز از قسم غلط العوام ہے بلکہ اس سے مراد تو تاتاری فتنہ (یا کوئی اور فتنہ) جو تقریباً ساتویں صدی ہجری میں ظہور پذیر ہو چکا ہے اور جس فتنہ نے مسلمانوں کی عزت و عظمت اقبال و جلال حکومت و سلطنت دین و مذہب اور فلک بوس شہرت کو پیوند خاک کر دیا تھا چلئے ہم برقؔ صاحب کی اس ضد اور اصرار کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں لیکن یہ تو بتلائیے کہ فتح کس کی ہو گی ؟ ہماری یا برقؔ صاحب کی ؟ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کئی سو سال تک اور حضرت ذوالقرنین کے بعد کئی ہزار سال تک یہ پیشگوئی پوری نہ ہو اور برقؔ صاحب کی تحقیق انیق کے رُو سے ہم یہی کہتے جائیں کہ وحی جلی ہے مخبر صادق کا قول ہے خدائی الہام ہے مذاق نہیں تو اور کیا ہے ۔ (العیاذ باللہ) یا جیسے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۔

(الآیۃ پ۳۔ آل عمران رکوع ۹) اور جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں سے وعدہ لیا البتہ جو کچھ دوں میں تم کو کتاب اور حکمت سے پھر آئے تمہارے پاس پیغمبر تصدیق کرنے

والا اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے البتہ ایمان لائیو اس پر اور البتہ مدد کیجیو اُسکی الخ
حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ اس آیت کی تفسیر میں ارشاد
فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسٰی علیہ السلام تک تمام
پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی اور پیش گوئی فرمائی کہ تمہارے بعد ایک ذوالعزم
رسول دنیا میں تشریف لائیں گے جن کا نام نامی اور اسم گرامی محمد اور احمد ہوگا صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم تم سب اس بات کا اقرار اور عہد کرو کہ اگر تم نے ان کا زمانہ پایا تو اُن
کی مدد کرو گے اور ایمان تو بہرحال ان پر لانا ہی ہوگا چنانچہ تمام انبیاء عظام علیہم الصلوٰۃ
والسلام نے اس کا اقرار کیا جیسا کہ قرآن کریم میں بصراحت یہ مذکور ہے اور یہ عہد و پیمان
محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان اور فضیلت ظاہر کرنے کے لیے
لیا تھا ورنہ خداوند عزیز کے علم میں وہی کچھ تھا جو دنیا میں رُونما ہوا کہ آپ سب
پیغمبروں کے بعد دنیا میں تشریف لائے حضرت عیسٰی علیہ السلام زندہ آسمان پر اُٹھا
لیے گئے تھے۔ اور باقی حضرات وفات پاکر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔ برقؔ صاحب ہی ازراہ بزرگی
یہ فرمائیں کہ حضرت آدم علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام اور اسی طرح دیگر انبیاء علیہم السلام کے بعد کتنے ہزار سال
یا کتنی صدیاں گذر چکی تھیں کہ یہ پیشگوئی پوری ہوئی؟ اور کتنے عرصہ کے بعد عرب
کی سرزمین پر نبی اُمّی فداہ ابی وامی کا ظہور ہوا اور آفتاب نبوت سے تاریک دنیا چمکی
اور منور ہوئی؟ ہم اس وحی جلی اور الہام ربانی کے بارے میں کیا خیال رکھیں؟ ہو سکتا
ہے کہ برقؔ صاحب پینترا بدل کر یہ فرمائیں کہ اس آیت کا مطلب اور تفسیر یہ نہیں
ہے بلکہ اس کا مطلب جیسا کہ بعض مفسرین کرامؒ نے بیان کیا ہے یہ ہے کہ ہر پہلے نبی سے
بعد کو آنے والے نبی کے حق میں مدد و نصرت کرنے کا میثاق لیا جاتا تھا کہ خود اس
کا اقرار کریں اور اپنی اپنی امت کو اس کی تلقین کریں کہ ہمارے بعد اللہ تعالیٰ کے
جو رسول تشریف لائیں گے ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا بھی تمہارے فریضہ میں

داخل ہے۔ لیجئے ہم برق صاحب کی اس تفسیر کو بھی صحیح تسلیم کرتے ہیں مگر بفضلہ تعالیٰ فتح پھر ہماری ہوگی کیونکہ مثلاً اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے یہ میثاق اور عہد لیا تھا کہ آپ کے بعد جو نبی (جو غالباً حضرت ہود علیہ السلام ہوں گے جیساکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے) تشریف لائیں گے تو اُن پر ایمان لانا اور اُنکی مدد کرنا بھی آپ کے فریضہ میں داخل ہے اور غالباً یہ عہد و پیمان حضرت نوح علیہ السّلام سے اُسی وقت لیا گیا ہوگا جس وقت ان کو نبوّت اور رسالت ملی ہوگی۔ کیونکہ حلف وفاداری اور عہد و پیمان کا اس سے بہتر اور کون سا موقع ہوسکتا تھا؟ اور چالیس سال قبل از نبوّت کا زمانہ بھی ہم برق صاحب کی دلجوئی کے لیے ساقط کر دیتے ہیں اور قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو برس قوم میں تبلیغ کرتے رہے تو گویا نو سو دس سال اس حساب سے حضرت نوح علیہ السلام اس عہد و پیمان کے بعد زندہ رہے اور نہ معلوم ان کی وفات کے بعد کتنے عرصے کے بعد حضرت ہود علیہ السّلام دنیا میں تشریف لائے اور اسی پر دوسرے انبیاء کے عہد کو قیاس کر لیجیے۔ برق صاحب فرمائیں کہ یہ طویل المیعاد پیشگوئی جو بصورت میثاق لی گئی تھی کم و بیش ایک ہزار سال پوری نہ ہو اور ہم یہی کہے جائیں کہ یہ وحی جلی ہے خدائی الہام ہے مخبر صادق کا قول ہے اس پر ایمان لاؤ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟ ایسی پیشگوئی تو ہر شخص کر سکتا ہے (عیاذاً باللہ) آئیے اس سے بھی واضح تر مثال سے ہم برق صاحب کو سمجھاتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے کہ۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (الآیۃ، پ ۲۸، الصف، رکوع ۱) اور جس وقت عیسیٰ بن مریمؑ نے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل تحقیق سے میں تمہاری طرف خدا تعالیٰ کا رسول ہو کر آیا ہوں

تصدیق کرتا ہوں اس چیز کی جو میرے آگے ہے تورات سے اور خوشخبری و پیشگوئی
دینے والا ہوں ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہوگا (صلی اللہ علیہ وسلم)
یہ محض پیش گوئی ہی نہیں بلکہ بشارت اور خوشخبری کی گراں مایہ دولت اپنے اندر
رکھتی ہے۔ برق صاحب ہی فرمائیں کہ حضرت عیسی علیہ السلام کے کتنے عرصے
اور کتنی صدیوں کے بعد یہ پیش گوئی پوری ہوئی؟ فرمایئے برق صاحب اگر تقریباً
پونے چھ سو سال تک ایک قرآنی خوشخبری اور پیش گوئی پوری نہ ہو اور ہم یہی کہتے
جائیں کہ یہ وحی جلی ہے مخبر صادق کا قول ہے خدائی الہام ہے اس پر ایمان لاؤ
مذاق نہیں تو کیا ہے؟ (العیاذ باللہ) برق صاحب ؎

ٹھوکریں مت کھایئے چلیے سنبھل کر دیکھ کر
چال سب چلتے ہیں لیکن بندہ پرور دیکھ کر

برق صاحب اگر یہ پیشگوئیاں جن میں بعض کئی صدیوں کے بعد پوری ہوئی
ہیں اور بعض ابھی تک پوری بھی نہیں ہوئیں صحیح ہیں اور واقعی صحیح ہیں اور کوئی مسلمان
ان کو جھوٹا نہیں کہتا اور نہ ان سے مذاق اڑاتا ہے تو اسی طرح آپ قیصر وغیرہ کی
تباہی اور ہلاکت کی پیش گوئی کو بھی صحیح تسلیم کر لیجئے جو صحیح بخاری میں درج
ہے اور پختہ کار محدث سے بلا وجہ بدظنی نہ کیجئے جنہوں نے ایک ایک حدیث
احتیاط کی چھاننی میں چھان کر صحیح بخاری میں درج کی ہے اور جن میں ایک ایک
حدیث بزبان حال برق صاحب کو یوں خطاب کر رہی ہے کہ ؎

ٹوٹ جائے نہ تیغ اے قاتل
سخت جاں ہوں ذرا سمجھ کر کھینچ

اب آیئے کہ ہم برق صاحب کی اس جرأتِ رندانہ پر بھی ایک طائرانہ
نگاہ ڈالیں کہ معلم کائنات اور مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم کو کن لفظوں میں بزعم خود

ایک مفید مشورہ تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

قیصر کے حسن سلوک اور کسریٰ کی بدتمیزی کا تقاضا تو یہ تھا کہ حضور صرف نسل کسریٰ کے خاتمہ کی پیش گوئی فرماتے اور ہرقل کے لیے اسی طرح محبت کا اظہار کرتے جس طرح وہ نجاشی سے کیا کرتے تھے لیکن جو پیشگوئی بخاری میں موجود ہے وہ ہماری اس تمنا کو پورا نہیں کرتی (بلفظہ دو اسلام صـ ۱۷۷ صـ ۱۷۸ طبع اوّل وصـ ۱۹۰ و صـ ۱۹۱ طبع ششم) حقیقت یہ ہے کہ نجاشی (جن کا نام حضرت اصحمہؓ تھا) ملک حبشہ کا بادشاہ ہونے کے باوجود نہ صرف یہ کہ خود مسلمان ہوا بلکہ کثیر التعداد مہاجرین صحابہ کرامؓ کی جانی و مالی امداد بھی کی اور انتہائی بہترین سلوک سے پیش آیا اور دنیائے دوں کو لات مار کر آخرت کو ترجیح دی بخلاف قیصر روم کے کہ اس نے گو قافلۂ تجارت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ احوال معلوم کیے اور ذاتی اور منطقی طور پر ظاہری تصدیق بھی کی لیکن جب جب قوم کا رُخ بدلا ہوا دیکھا تو نار کو اقرار پر اور سلطنت کو اسلام پر اور متاعِ دنیوی کو ایمان پر ترجیح دی اور پھر آگے چل کر اسلامی فوجوں کے مقابلہ پر اتر آیا۔ کیا برق صاحب کے عدل کا تقاضا یہی ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مومن اور کافر، خدا پرست اور دنیا پرست میں کوئی فرق نہ کرتے؟ کیا ان دونوں میں فرق نہیں ہونا چاہیے تھا؟ ہاں مگر یہ ضرور تھا کہ ہرقل روم نے کسریٰ کی طرح انتہائی بربریت اور درندگی کا ثبوت بھی نہیں دیا تھا اس لیے حکمت کا تقاضا ہی یہی تھا کہ کسریٰ کو مزید مہلت نہ ملتی اور قیصر کو اس کی ظاہری رواداری اور سلوک پر مہلت مل جاتی جب کہ عیسائی ہونے کی وجہ سے وہ آسمانی مذہب کا قائل تھا اور کسریٰ آتش پرست اور مجوسی تھا علاوہ بریں اگر آپ ہرقل اور اس کی نسل کی کلیتہً تباہی اور بربادی کی پیش گوئی فرماتے تو عیسائی اقوام کو یہ تہذیب و تمدن اور چمک دمک جس پر برق صاحب مفتون ہیں کہاں سے دستیاب ہوتی اور برق صاحب کو پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کہاں سے

ملتی ہے سچ ہے کہ ع

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

برق صاحب کا حدیث پر چونتیسواں اعتراض

برق صاحب ایک حدیث پر اعتراض کرنے کے لیے ایک تمہید قائم کرتے ہیں اور پھر اس پر اعتراض کرتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ شیطان کا طول وعرض کہتے ہیں کہ پیشانی طولِ جسم کا سولہواں حصہ ہوتی ہے انسان کا قد اوسطاً ۶۴ انچ ہوتا ہے اور اس کی پیشانی چار انچ باقی حیوانات میں بھی یہی نسبت پائی جاتی ہے۔ ماہرین ارض وسما نے سالہا سال کی تحقیق و تلاش کے بعد اعلان کیا ہے کہ زمین کا محیط ۲۵ ہزار میل ہے یعنی اگر ہم ایک ۲۵ ہزار میل لمبا دھاگہ تیار کر کے زمین کے گرد لپیٹ دیں تو وہ بالکل پورا ہو جائے گا۔ اسی طرح سورج زمین سے بارہ لاکھ اسی ہزار گنا بڑا ہے اور اس کا محیط بتیس ارب پچاس کروڑ میل۔

ابن عمرؓ حضور سے روایت کرتے ہیں کہ سورج نکلتے اور ڈوبتے وقت نماز نہ پڑھا کرو اس لیے کہ سورج بوقت طلوع شیطان کے دو سینگوں میں پھنسا ہوا ہوتا ہے (بخاری ج ۲ ص ۱۳۴)

سورج کی موٹائی ساڑھے بتیس ارب میل ہے اگر اتنی بڑی چیز شیطان کے دو سینگوں میں سما جاتی ہے اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ پیشانی طول جسم کا سولہواں حصہ ہوتی ہے تو شیطان کے جسم کی لمبائی پانچ کھرب بیس ارب میل ہونی چاہیے اور چوڑائی بھی اسی نسبت سے اتنا بڑا شیطان کھڑا کہاں ہوتا ہوگا زمین سے سورج نو کروڑ پینتیس لاکھ میل دور ہے اور شیطان کی لمبائی سوا پانچ کھرب میل اگر شیطان کو زمین پر کھڑا کیا جائے تو سورج اس کے ٹخنوں سے بھی نیچے رہ جاتا ہے الخ پھر آگے لکھتے ہیں کہ کلکتہ کی صبح چند لمحوں کے بعد بنارس پہنچتی ہے۔ پھر دہلی، پھر لاہور،

پھر پشاور، پھر کابل وعلیٰ ہٰذا القیاس جس کا مطلب یہ ہوا کہ سورج ہر وقت شیطان کے سینگوں میں پھنسا رہتا ہے چونکہ ایسی حالت میں نماز ناجائز ہے اس لیے مسلمانوں کو نماز بالکل ترک کردینی چاہیئے ؎

شیخ مکتب کم سواد و کم نظر
از رموزِ علم و حکمت بے خبر

یہ ہے ہمارے مُلّا کا مبلغ علم ؎

مے تراشد ہر زباں لات و منات
مومن و قلبش حریم سومنات

(اقبالؒ۔ بہ ترمیم)

(انتہیٰ بلفظہٖ دو اسلام ص ۳۲۴ و ص ۳۲۵ طبع اوّل و ص ۳۲۵ و ص ۳۲۶ طبع ششم)

جواب:۔ برق صاحب کی اس عبارت میں جو مرکزی نقاط قابل تحقیق ہیں وہ یہ ہیں۔
(۱) انسان اور دیگر حیوانات کی پیشانی ان کے طول جسم کا سولہواں حصہ ہوتی ہے۔
(۲) سورج بوقت طلوع شیطان کے دو سینگوں میں پھنسا ہوا ہوتا ہے (۳) شیطان کے حقیقۃً دو سینگ ہیں اور سورج ان میں حقیقۃً پھنسا ہوا ہوتا ہے (۴) بڑی چیز چھوٹی چیز میں نہیں سما سکتی (۵) دو سینگوں کے درمیان کا فرق اتنا ہی ہوتا ہے جتنا پیشانی کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک (۶) چونکہ زمین گول ہے اور سورج ہر وقت زمین کے کسی نہ کسی حصے میں طلوع ہوتا رہتا ہے اس لیے مسلمانوں کو بالکل نماز ہی ترک کر دینی چاہیئے اور گویا یہ نماز مُلّا کے مبلغ علم پر بھینٹ چڑھ گئی ہے ترتیب وار ہم برق صاحب کے ان مرکزی نکات کے جوابات عرض کرتے ہیں بغور ملاحظہ فرمائیں۔

شق اوّل کا جواب:۔ برق صاحب کا یہ قاعدہ بطور قاعدہ کُلیہ کے انسانوں سے متعلق بھی غلط ہے اور حیوانات سے متعلق بھی انسانوں سے متعلق تو اس لیے کہ شائد

برقؔ صاحب نے بھی جاپانی روسی اور بعض دیگر ایسے ہی انسان دیکھے ہوں گے جن کی پیشانیاں نہایت کشادہ ہوتی ہیں مگر قد و قامت پست اسی طرح فن طب کے امام ابوزکریا رازی اور ابوعلی سینا وغیرہ اس کی تصریح کرتے ہیں کہ بعض انسانوں کے سر چوہوں اور سانپوں کے سروں کے بالکل مشابہ اور مماثل ہوتے ہیں اور ایسے لوگ آجکل بھی پائے جاتے ہیں عام لوگ ان کو بے علمی کی وجہ سے شاہ دولہ[1] کے چوہوں سے تعبیر کرتے ہیں جن کے قد لمبا اوقات عام انسانوں سے کافی لمبے اور پیشانیاں بالکل تنگ اور چھوٹی ہوتی ہیں اور برقؔ صاحب کی یہ خود ساختہ یا غیر مصدقہ منطق وہاں نہیں چل سکتی کہ پیشانی طول جسم کا سولہواں حصہ ہوتی ہے اور حیوانات سے متعلق اس لیے یہ قاعدہ غلط ہے کہ غالباً برقؔ صاحب نے بھی سانپ، مار ماہی، خراطین (گنڈوئے) اور کنکھجورا وغیرہ جانور دیکھے ہی ہوں گے برقؔ صاحب ہی اپنی تدقیق و تحقیق کے زور سے یہ ارشاد فرمائیں کہ کیا سانپ کی پیشانی اس کے طول جسم کا سولہواں حصہ ہوتی ہے؟ مُلّا بیچارے کے مبلغ علم کا قصہ ہی چھوڑ دیجئے وہ تو مہد سے لحد تک علم تلاش کرتا رہتا ہے اور معہذا یہ کہتا رہتا ہے کہ میں ہیچمیداں ہوں آپ جس کو

---

[1] ایسے لوگ پہلے بھی ہوتے تھے جب کہ حضرت شاہ دولہ کی ولادت بھی نہیں ہوئی تھی اور اب بھی دیگر ممالک مثلاً انڈونیشیا اور افریقہ وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا خاص نمونہ ہوتے ہیں اور ظاہری سبب اس کا یہ ہوتا ہے کہ ماں کے رحم میں پہلی بار اتنی وسعت اور فراخی نہیں ہوتی جس سے بچے کا سر کما حقہٗ نشو و نما پا سکے اور پہلا بچہ ہی عموماً ایسا ہوتا ہے اور پھر جب ماں کا رحم کھل جاتا ہے تو بعد کو پیدا ہونے والے بچے صحیح حالت میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کے سر دیگر اعضاء سے تناسب رکھتے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔

تحقیق خیال کیے بیٹھے ہیں اُس سے کام لیجئے اور فرمایئے کہ قصّہ کیا ہے ؟ معاف فرمایئے گا جس کو آپ تحقیق سمجھے بیٹھے ہیں وہ صرف ظاہر بینی اور افسانہ ہے کیا خوب کہا گیا ہے کہ ع

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

دوسری شق کا جواب :۔ متعدد قومیں پہلے بھی ایسی گذر چکی ہیں اور آج اس دورِ تہذیب و تمدن میں بھی موجود ہیں کہ سورج چڑھتے وقت (اور غروب ہوتے وقت) اس کو سلام کرتی اور نظامِ عالم کا کرتا دھرتا اس کو سمجھتی ہیں اور ہاتھ جوڑ کر اس سے استدعاء کرتی ہیں کہ اے روشن و منور آقا یہ دن ہم پر خیر و عافیت سے گذرے تو گویا طلوعِ آفتاب مشرکوں اور آفتاب پرستوں کی عبادت کا وقت ہے اس طلوع کے وقت ابلیس لعین پانچواں سوار بن کر حقیقی یا مثالی طور پر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور پھولے نہیں سماتا کہ یہ لوگ میرے گمراہ کرنے کی وجہ سے سورج کی پرستش کر رہے ہیں گویا درحقیقت یہ میری ہی عبادت ہو رہی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو شرک کے وہم سے بھی بچانے کی انتہائی سعی فرمائی ہے کہ تم ایسے وقت نماز بھی نہ پڑھو کیونکہ انما ھی ساعۃ صلوٰۃ الکفار (نسائی ج۱ ص۶۶) یہ تو کافروں کی عبادت کا وقت ہے اور تمہاری عبادت ان کی عبادت سے یقیناً جدا اور الگ ہونی چاہیئے یہ تھا حدیث کا صحیح مفہوم مگر برق صاحب نے اپنی تحقیق کے زور سے اس کا مطلب بگاڑ دیا ہے اور اپنی طرف سے یہ جملہ کہ پھنسا ہوا ہوتا ہے اضافہ کیا ہے اور اپنی طرف سے یہ پیوند لگا کر حدیث کا مطلب اور ترجمہ مسخ کر دیا ہے، برق صاحب نے دیگر کتابوں میں عموماً اور دو اسلام میں خصوصاً اس پر بہت زور دیا ہے کہ مُلّا جہالت اور خیانت کا پتلا ہوتا ہے مگر خیر سے برق صاحب کے اعتراضات کی گاڑی ہی ان دو پہیوں پر چل رہی ہے ولنعم ما قیل ؎

غیر کی آنکھوں کا تنکا تجھ کو آتا ہے نظر
دیکھ اپنی آنکھ کا غافل ذرا شہتیر بھی

تیسری شق کا جواب :- چونکہ ابلیس جن ہے جیسا کہ قرآن کریم میں اس کی تصریح موجود ہے اور جنات کے لیے سینگ کا ہونا ضروری نہیں ہے اس لیے اگر بین قرنی الشیطان (کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع کرتا ہے) سے مراد اس کے سر کے دو کنارے مراد ہوں تو اس میں کیا خرابی ہے؟ قرن کے معنی سینگ کے بھی آتے ہیں قرن سے سر کے دو کنارے بھی مراد ہو سکتے ہیں قرن کا لفظ سر پر اطلاق ہوتا ہے سنا ہی ہوگا از قرن تا قدم اور لغت کی کتابوں میں اس کی تصریح ہے (دیکھئے ص۱۲ و ص۵۱۵ تاج العروس وغیرہ) اور شراح حدیث نے بھی اس کی تصریح کی ہے کہ المراد بقرنیہ ناحیتا رأسہ (نووی شرح مسلم ج ۱ ص۲۷۵ و مرقات وغیرہ) کہ شیطان کے دو سینگوں سے اس کے سر کی دونوں جانب مراد ہیں۔ اور عرف عام میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ گرمی کے موسم میں سورج فلاں اور فلاں پہاڑ یا فلاں اور فلاں درخت یا فلاں اور فلاں مکان کے درمیان سے طلوع کرتا ہے اور سردیوں میں فلاں اور فلاں کے درمیان سے۔ اس سے کوئی عقلمند یہ نہیں سمجھتا کہ سورج پہاڑوں اور درختوں ٹیلوں اور مکانوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور نہ اس سے عوام برق صاحب کی طرح پھنسا ہوا ہوتا ہے سمجھتے ہیں اور بول چال اور گفتگو کا یہ طریقہ صحیح اور رائج سمجھا جاتا ہے اور کوئی منصف مزاج اس قسم کا کلام کرنے والوں کے مبلغ علم کا رونا نہیں روتا مگر برق صاحب ہیں کہ بلا دلیل مُلّا بیچارے کو کوستے ہیں ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اور اگر بالفرض شیطان کے حقیقتاً دو سینگ ہوں تب بھی گذر چکا ہے

کہ عُرفی طور پر یہ کہنا بالکل صحیح اور بجا ہے کہ سورج اُس کے دو سینگوں کے درمیان سے طلوع ہوتا ہے۔ ہاں البتہ "پھنسا ہوا ہوتا ہے۔" کا مفہوم خ[illegible]ں ایجاد بندہ ہے حدیث میں اس کا کہیں نشان موجود نہیں ہے اور اسی مفروض پر برق صاحب کا اعتراض مبنی تھا جس کی وجہ سے بلا سبب وہ اوہام اور خیالات کی وادیوں میں شیطان کے طول وعرض کی پیمائش کرتے پھرے ہیں ؏

کچھ حال ہے عجب دلِ آئینہ ساز کا

چوتھی شق کا جواب:۔ اگر برق صاحب کی مراد یہ ہو کہ حقیقۃً بڑی چیز چھوٹی چیز میں نہیں سما سکتی تو یہ صحیح ہے مگر عرض کیا جا چکا ہے کہ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سورج حقیقۃً شیطان کے دو سینگوں میں پھنسا ہوا طلوع کرتا ہے بلکہ اس سے مراد صرف اتنی ہے کہ عُرفی طور پر اس کے دو سینگوں کے درمیان سے طلوع کرتا ہے اور یہ نظریہ قابل اعتراض نہیں ہے اور اگر برق صاحب کی مُراد یہ ہو کہ مطلقاً بڑی چیز چھوٹی چیز میں نہیں سما سکتی گو مثالی طور پر ہی ہو تو یقیناً باطل ہے۔ برق صاحب ہی فرمائیں کہ کیا بڑے بڑے پہاڑوں اور ٹیلوں کو فلک بوس مکانوں اور قلعوں کو انسانوں اور حیوانوں کو کیمروں کے ذریعہ ان کے فوٹو اتار کر چھوٹے چھوٹے کاغذوں میں بند نہیں کر دیا جاتا ؟ کیا برق صاحب نے کبھی فوٹو اور تصویریں ملاحظہ نہیں فرمائیں ؟ اس کو جانے دیجئے یہ فرمایئے کہ بڑے بڑے پہاڑوں اور مکانوں کی، حیوانوں اور دیو ہیکل انسانوں کی مثالی شکلیں اور صورتیں چھوٹی سی آنکھ میں کس طرح سما جاتی ہیں ؟ اور وہی برق صاحب کا سورج جو زمین سے بارہ لاکھ اسی ہزار گنا بڑا ہے اور جس کا محیط بتیس ارب پچاس کروڑ میل ہے ایک چھوٹی سی آنکھ میں وہ کیسے سما جاتا ہے ؟ پوری آنکھ بھی نہیں بلکہ آنکھ کی بھی چھوٹی سی پتلی، برق صاحب ہی ازراہ بزرگی یہ ارشاد فرمائیں کہ قرآن کریم میں اللہ نے حضرت ذوالقرنین کا واقعہ نقل کیا ہے اور اس میں اس کا ذکر ہو

فرمایا ہے کہ جب وہ مغرب کی طرف گئے تو وَ تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَۃٍ۔ یعنی ذوالقرنین نے دیکھا کہ سورج ایک سیاہ چشمہ میں ڈوب رہا ہے جس سورج کا محیط بتیس ارب پچاس کروڑ میل ہے اور جو زمین سے بارہ لاکھ اسی ہزار گنا بڑا ہے وہ زمین کے مغربی کونے کے ایک چشمہ (عین حمئۃ) میں ذوالقرنین کو کیسے ڈوبتا نظر آیا؟ اور اتنا بڑا سورج ایک چھوٹے سے (گو وہ فی نفسہٖ بحر بیکراں اور سمندر ناپید کنار ہی سہی مگر سورج کے مقابلہ میں تو وہ بے مقدار ہی ہے) چشمہ میں کیسے سما گیا؟ برقی صاحب کو مناسب تھا کہ وہ مُلّا کے مبلغ علم کا ماتم کرنے سے پہلے ٹھنڈے دل سے اس حقیقت کو سوچ لیتے اور اس کے بعد قلم تحقیق کو جنبش دیتے مگر اُن کی بلا سے وہ تو میدانِ اوہام اور ظنون میں بے سر وپا باتیں کرنے اور خیالی گھوڑے دوڑانے کے عادی ہیں نہ دماغ پر کنٹرول ہے اور نہ قلم قابو میں ہے۔

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش

صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

پانچویں شق کا جواب:۔ برقی صاحب نے گو یہ بات کھل کر بیان نہیں کی مگر ان کے فرضی مقدمات سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کے خیال میں پیشانی کے دو کناروں کا اور سینگوں کا درمیانی فاصلہ برابر ہوتا ہے مگر یہ بھی قطعاً غلط ہے ایک معمولی سمجھ والا آدمی بھی اس امر سے بخوبی واقف ہے کہ پیشانی کے دونوں کناروں کے درمیانی فاصلہ سے کہیں زیادہ بلکہ دونوں سینگوں کا درمیانی فاصلہ ہوتا ہے کیونکہ عموماً سینگ سیدھے نہیں ہوتے بلکہ منحنی (ٹیڑھے) ہوتے ہیں حتیٰ کہ دونوں سینگوں کا درمیانی فاصلہ مبداء کے فاصلہ سے زیادہ ہوگا اور دونوں سینگوں کے کناروں کا فاصلہ بعض جانوروں میں درمیانی فاصلہ سے کم اور بعض میں زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ مخفی نہیں ہے اس لحاظ سے شیطان کے طول و عرض کا بھی

فرق نکلے گا لہذا برقی صاحب کو اپنی پیمائش اور سروے پر نظر ثانی کرنی چاہیئے تاکہ آپکی علمی تحقیق سے ہم بھی مستفید ہوں۔

نگاہ لطف کے امید وار ہم بھی ہیں

چھٹی شق کا جواب:۔ برقی صاحب نے مسلمانوں کو نماز کی چھٹی دے کر دل کی بات کہی ہے اس لیے کہ وہ شعائر اسلام نماز اور روزہ وغیرہ بلکہ خود نمازیوں سے جی بھر کر مذاق اڑاتے ہیں جیساکہ ان کی جملہ کتابوں سے ان کا یہ عندیہ آشکارا ہے لیکن یہاں انہوں نے ملا بیچارے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی کوشش کی ہے برقی صاحب غور فرمایئے ہر جگہ اور زمین کے ہر حصہ کے مسلمانوں کے لیے اُن کے اُفق اور اُن کے مشرق اور مغرب کا اعتبار ہو گا کلکتہ والوں کے لیے ان کے طلوع آفتاب کا لحاظ ہو گا اور لاہور و کابل والوں کے لیے ان کے طلوع اور غروب کا۔ کلکتہ والے اس وقت نماز نہ پڑھیں جب کہ ان کے اُفق پر سورج طلوع یا غروب ہوتا ہو اور کابل والے اپنے طلوع و غروب کے وقت اس سے باز رہیں ہاں یہ بات الگ ہے کہ اگر کوئی مسلمان برقی کرامت سے زمین کے ہر ایسے حصہ پر پہنچ جاتا ہو جہاں ہر وقت طلوع اور غروب ہی سے اسکو واسطہ پڑتا ہو اور درمیانی وقت اس کو مطلقاً نصیب ہی نہ ہوتا ہو تو یہ جدا بات ہے مگر عقلی اور نقلی طور پر اس کا ثبوت درکار ہے کہ آنِ واحد میں وہ ہر مقامِ طلوع اور ہر مقامِ غروب پر بلا مُرورِ وقت پہنچ سکتا ہے محض فرضی امکان سے شرعی احکام پر زد نہیں پڑتی کما لا یخفی۔ اچھا برقی صاحب یہ فرمائیں کہ جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زمین تقریباً گول ہے اور زمین کے کسی نہ کسی حصہ پر ہر وقت سورج طلوع ہوتا رہتا ہے۔ اور طلوعِ آفتاب کے وقت غیر معذور مسلمانوں کو رمضان شریف میں کھانے پینے وغیرہ کی مطلقاً اجازت نہیں ہے اس لیے مسلمانوں کو رمضان شریف میں

برقؔ صاحب کی خود ساختہ منطق کے رُو سے کھانا پینا بالکل ترک کر دینا چاہیئے کہ نہ رات کو کھائیں اور نہ دن کو یہ ہے برقؔ صاحب کا مبلغ علم فرمایئے اگر کوئی خشک مُلّا آپ کے پیش کردہ اشعار کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ یوں ادا کرے تو کیا حرج ہے ؟ ؎

رند مشرب کم سواد و کم نظر | از رموز علم نبوی بے خبر
مے تراشد ہر زماں از خود مناتؔ | مسلم اش گویند و قلبش سومناتؔ

(اقبالؔ بہ ترمیم)

برقؔ صاحب کا حدیث پہ پینتیسواں ۳۵ اعتراض

برقؔ صاحب نے ایک صحیح حدیث کو غلط اور باطل قرار دینے کے لیے زمین و آسمان کے خوب قلابے ملائے ہیں اور کئی صفحات اس پر سیاہ کر دیے ہیں جس کا خلاصہ صرف اتنا ہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ روزہ کی حالت میں کھانا پینا اور دیگر خواہشات سے بچنا چاہیئے اور فرمایا کہ جس شخص نے جھوٹ اور بدکاری وغیرہ نہ چھوڑی تو اللہ تعالیٰ کو اس کی بھوک اور پیاس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے حالانکہ حدیث یہ بتلاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم روزہ کی حالت میں حضرت عائشہ رضؓ سے مباشرت کیا کرتے تھے اور پھر آگے مباشرت اور حیض کی نمایاں سُرخی قائم کر کے مباشرت فی الحیض کی حدیث سے خوب مذاق اڑایا ہے چنانچہ ہم ان کے بعض ضروری ضروری الفاظ اور عبارات آپ سے عرض کرتے ہیں۔ برقؔ صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

آیئے اب دیکھیں کہ حضور علیہ السلام نے اپنے ان ارشادات پر خود کہاں تک عمل کیا بخاری میں ہے عن عائشۃؓ قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقبل ویباشر وھو صائم (بخاری صـ۲۲۶) حضرت عائشہ رضؓ

فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام روزہ رکھ کر اپنی ازواج کے بوسے لیتے اور ان سے مباشرت فرمایا کرتے تھے۔

مباشرت کے معنی ہیں مجامعت اور بوس و کنار وغیرہ لیکن اس حدیث میں مباشرت سے مراد کیا ہے مولانا شبیر احمد عثمانی کی زبانی سنیئے آپ صحیح مسلم کی اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے فتح الملہم ج ۳ ص۱۵۶ میں فرماتے ہیں۔

المباشرت فوق السرة وتحت الركبة بالذكر او القبلة او المعانقة او اللمس او غير ذٰلك حلال باتفاق المسلمين[1]۔ آپ روزہ رکھ کر عورت کے ساتھ ناف سے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے مباشرت کر سکتے ہیں یعنی اُسے چھُو سکتے ہیں چوم سکتے ہیں گلے لگا سکتے ہیں اور آلہ تناسل استعمال کر سکتے ہیں۔

یہ حدیث کئی طرح سے محل نظر ہے اوّل روزے کا مقصد شہوات کو ترک کرنا ہے نہ کہ بوس و کنار اور گھٹنوں سے نیچے آلہ تناسل کا استعمال دوم یہ حدیث اوپر والی حدیثوں سے متصادم ہوتی ہے سوم یہ قرآن سے ٹکراتی ہے قرآن کہتا ہے اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ... فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ (بقرہ) ماہ رمضان میں رات کے وقت ہم تمہیں بیویوں سے متمتع ہونے کی اجازت دیتے ہیں (آغاز اسلام میں رات کے وقت بھی بیویوں سے اختلاط ممنوع تھا بعض صحابہ ترک نہ سکے تو یہ پابندی دور کر دی گئی اور فرمایا کہ اب تم اُن سے مباشرت کر سکتے ہو۔ یعنی صرف رات کے وقت مباشرت

---

[1] برقؔ صاحب نے فتح الملہم کی عبارت نقل کرنے میں کم و بیش پانچ غلطیاں کی ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ فتح الملہم میں باتفاق العلماء کا جملہ ہے مگر نہ معلوم کس مصلحت کے پیش نظر برقؔ صاحب کے ہاں وہ باتفاق المسلمین بن گیا ہے۔

کی اجازت ہے۔ لیکن یہ حدیث کھلی چھٹی دیتی ہے کہ دن ہو یا رات کام چلائے چلو
پھر چند وجوہ اور لکھ کر آگے برق صاحب لکھتے ہیں کہ

یہی وہ حدیث ہے جس نے مجھے احادیث سے بدظن کیا اور اس کتاب کی محرک بنی پھر آگے لکھتے ہیں کہ

سوال:۔ ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ حضور کو اپنے آپ پر زبردست ضبط حاصل تھا ان کی مباشرت محرک جماع نہیں ہو سکتی تھی اس لیے ان کا یہ عمل چنداں قابلِ اعتراض نہیں۔

جواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل امت کے لیے واجب التقلید ہے۔ مانا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضبط نفس کی نعمت سے بہرہ ور تھے لیکن امت میں کتنے ایسے لوگ موجود ہیں جو معانقہ کے بعد جماع سے رک سکیں گے پھر آگے لکھتے ہیں۔

لیکن دوسری طرف ہمارے محدثین اس لذیذ فعل کے اس قدر شائق تھے کہ ایک سے ایک بڑھیا حدیث گھڑتے چلے گئے امام بخاری اور مسلم نے تو صرف بوس وکنار اور گھٹنوں سے نیچے استعمال آلت کی اجازت دی تھی ابوداؤد ایک قدم اور آگے نکل گئے کہتے ہیں۔

عن عائشةؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقبلھا ویمص لسانھا وھو صائم حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزہ رکھ کر مجھے چومتے اور میری زبان چوستے تھے پھر آگے لکھتے ہیں:۔ اور ساری قوم میں حضرت عائشہؓ ہی کو کیا پڑی تھی کہ مباشرت کی تلقین کرتی پھریں آخر حضور علیہ السلام کے حرم میں دس اور ازواج بھی تھیں ہر صحابیؓ کے گھر میں ایک ایک بیوی تھی[1] خود صحابہ کے منہ

---

[1] اس کا فلسفہ تو برق صاحب ہی تحریر فرمائیں گے کہ کیا ہر ایک صحابی کے گھر میں بیوی تھی کوئی بلا بیوی تو نہ تھا اور پھر کیا ہر ایک کے گھر میں صرف ایک ہی بیوی ہوتی تھی یا زیادہ بھی تھیں دیکھئے کیا لب کشائی فرماتے ہیں؟

میں بھی زبان تھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ مباشرت کی اکثر احادیث حضرت عائشہؓ سے منقول ہوئیں؟
(بلفظہٖ دو اسلام از صفحہ ۲۰۱ تا صفحہ ۲۰۷ طبع اوّل و از صفحہ ۲۱۵ تا صفحہ ۲۲۲ طبع ششم (ملتقطا)

جواب: حضرت عائشہؓ کی اس مباشرت والی روایت پر اعتراض کرنے میں برق صاحب ہی متفرد نہیں ہیں بلکہ اس روایت پر اعتراض تو عیسائیوں، آریوں اور شیعوں سے صدیاں بیت چکی ہیں کہ نقل در نقل ہوتا چلا آتا ہے اور اس روایت کے پیش نظر انہوں نے اسلام اور جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور حضرت عائشہؓ کی شانِ رفیع پر کیا کچھ طعنے نہیں کیے؟ اور انہیں سے برق صاحب کو یہ مصالحہ حاصل ہوا ہے مگر چونکہ یہی وہ روایت ہے جس نے برق صاحب کو احادیث سے بدظن کیا ہے اور یہی وہ حدیث ہے جو دو اسلام جیسی کتاب کے لکھنے کا سبب بنی ہے اس لیے ہم بھی قدرے تفصیل سے اس پر کلام کرتے ہیں لہٰذا بعض راز کی باتوں کی تشریح میں ہمیں معذور تصور فرمایئے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم برق صاحب کے اعتراض کے مرکزی نقطے آپ سے عرض کر دیں تاکہ جواب کے سمجھنے میں دقت پیش نہ آئے۔

مرکزی نقاط یہ ہیں۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات پر عمل نہیں کیا (العیاذ باللہ)
(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں مباشرت فرمایا کرتے تھے۔ ۳۔ اور آپ کی مباشرت کی وہی تفسیر ہے جو بحوالہ فتح الملہم نقل کی گئی ہے۔ ۴۔ مباشرت کی حدیث قرآن کریم سے ٹکراتی ہے۔ ۵۔ قرآن کریم صرف رات کے وقت مباشرت کی اجازت دیتا ہے مگر یہ حدیث کھلی چھٹی دیتی ہے کہ دن ہو یا رات کام چلائے جاؤ۔ ۶۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فعل امت کے لیے واجب التقلید ہے۔ ۷۔ امام بخاریؒ اور مسلم نے گھٹنوں سے نیچے استعمال آلت کی اجازت دی ہے۔ ۸۔ محدثینؒ اس فعل لذیذ کے بڑے شائق تھے اس لیے ایک سے ایک بڑھ کر صبا تدث

گھڑتے چلے گئے۔ ۹۔ امام ابوداؤدؒ نے روزہ کی حالت میں زبان چوسنے کی بھی اجازت دے دی ہے۔ ۱۰۔ صرف حضرت عائشہؓ کو کیا مصیبت پڑی تھی کہ وہ مباشرت کی حدیثیں بیان کرتی پھریں۔ ہم سہولت کے پیشِ نظر ترتیب وار ان شقوں کے جوابات عرض کرتے ہیں غور سے ملاحظہ کریں۔

پہلی شق کا جواب:۔ برقؔ صاحب نے مباشرت والی جس روایت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ٹکرا کر تعارض پیدا کرنے کی کوشش کی ان میں سے ایک کے ضروری حصہ کا ترجمہ برقؔ صاحب کے الفاظ میں یہ ہے خدا کی قسم اللہ کو روزہ دار کے منہ کی خوشبو کستوری کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے اس لیے کہ وہ کھانا پینا شہوت رانی اللہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے ارشاد کا ترجمہ ان کی زبانی یہ ہے جو شخص روزے کی حالت میں جھوٹ اور بدکاری سے باز نہیں رہ سکتا اُسے کہہ دو کہ اللہ کو اس کی بھوک اور پیاس کی قطعاً ضرورت نہیں دوسرے ارشاد میں تو کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ روزہ کی حالت میں بوسے لینا اور بدن سے بدن ملانا وغیرہ درست نہیں ہے اس لیے بوس کنار کی حدیث کا اس سے تعارض پیدا کرنا خود فریبی ہے البتہ پہلی روایت میں شہوت رانی سے اگر برقؔ صاحب بوس وکنار مراد لیتے ہیں اور پھر حدیث مباشرت سے تعارض پیدا کرتے ہیں تو یہ ان کی خوش فہمی ہے کیونکہ روزہ کی حالت میں جس شہوت رانی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کیا ہے وہ مجامعت ہے نہ کہ بوس وکنار اور اس قسم کی دیگر (میاں بیوی کی) دل لگی کی باتیں۔ برقؔ صاحب کو لازم تھا کہ وہ سیاق حدیث پر غور فرما لیتے کہ روزہ کی حالت میں کھانے اور پینے کے ساتھ جس شہوت رانی کا ذکر کیا گیا ہے وہ مجامعت ہے، یا بوس وکنار؟ روزہ کی حالت میں جھوٹ، بدکاری، کھانے، پینے اور مجامعت کے ساتھ بوس وکنار کی حدیث کا تعارض پیدا کرنا برقؔ صاحب ہی کا کمال ہو سکتا ہے۔ اور

اس غلط اور بے بنیاد مفروض کی بنا پر برق صاحب کا یہ لکھنا کہ آئیے اب دیکھیں کہ حضور علیہ السلام نے اپنے ارشادات پر خود کہاں تک عمل کیا۔ انتہا درجہ کی بے باکی اور جسارت پر مبنی ہے (نعوذ باللہ)

دوسری شق کا جواب:۔ بلاشک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں مباشرت کیا کرتے تھے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مباشرت کا معنیٰ کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں کس قسم کی مباشرت کیا کرتے تھے مباشرت کے متعدد معانی لغت میں آتے ہیں اور مفسرین کرامؒ نے بھی اس کی تصریح کی ہے چنانچہ قاموس کی مشہور ترین شرح میں لکھا ہے۔ کہ باشر الرجل المرأة اذا صارا فی ثوب واحد فباشرت بشرته بشرتها ومنه الحدیث انه کان یقبل ویباشر وهو صائم واراد به الملامسة واصله من لمس بشرة الرجل بشرة المرأة۔ (تاج العروس ج ۳ ص ۴۶) جب بیوی اور خاوند دونوں ایک ہی لباس میں اکٹھے ہو جائیں اور خاوند کا جسم عورت کے جسم سے چھو جائے تو اس کو مباشرت کہتے ہیں اور اس حدیث کا بھی یہی مطلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں مباشرت کرتے تھے اور اس سے مراد بدن سے بدن کا ملنا ہے اور مباشرت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ مرد کا بدن عورت کے بدن سے چھو جائے۔

اس اقتباس سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ مباشرت کی حقیقت جماع اور مجامعت نہیں ہے یہ تو اس سے کنایہ ہے اصل معنیٰ مباشرت کا بدن کا بدن سے چھونا ہے۔ علامہ ابوبکر الجصاص الرازیؒ (المتوفی ۳۷۰ھ) لکھتے ہیں کہ:۔

حقیقة المباشرة هی الصاق البشرة بالبشرة من ای موضع کان من البدن مباشرت کا حقیقی معنیٰ بدن کا بدن سے چھو جانا ہے خواہ جس حصہ سے

ہو (احکام القرآن ج ۱ ص ۲۹) شیعہ حضرات کی مشہور تفسیر میں لکھا ہے کہ
والمباشرت الصاق البشرۃ بالبشرۃ وھی ظاھر الجلد مباشرت کا معنیٰ
یہ ہے کہ بدن کی ظاہری کھال سے بدن ملے اور اس کو چھوئے (تفسیر مجمع البیان ج ۱ ص ۱۱۹)
یہ عبارات اس مطلب کو واشگاف کرتی ہیں کہ مباشرت کا حقیقی معنیٰ اور مطلب
یہ ہوتا ہے کہ بدن کے جس حصہ سے ہو اور خاص طور پہ بدن کے ظاہری کھال سے بدن
چھو جائے مباشرت میں کہیں مجامعت کا مفہوم داخل نہیں ہے ہاں کنایہ کے
طور پر مجازاً اس سے مجامعت بھی مراد ہو سکتی ہے مگر موقع اور مقام کا لحاظ کرنا ہوگا
اور برق صاحب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ مباشرت کے معنیٰ ہیں مجامعت
اور بوس و کنار وغیرہ (دو اسلام ص ۲۰۱ طبع اول اور طبع ششم ص ۲۲۱ و ص ۲۲۲ پہ لکھا ہے
کہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں مباشرت سے مراد صرف بوس و کنار ہے) اور حضرت
عائشہؓ ہی کی روایت میں جس کو برق صاحب نے بھی نقل کیا ہے، اس کی تصریح موجود
ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تہ پوش پہننے کا حکم دیتے تھے اور پھر بدن
کے ساتھ بدن ملا کر ایک جگہ سو جایا کرتے تھے اور حضرت عائشہؓ اس کی بھی تصریح
فرماتی ہیں کہ گو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی مباشرت مجھ سے کیا کرتے تھے
لیکن امت کو آگاہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں ایکم یملك اربہ (بخاری ج ۱
ص ۴۴ و مسلم ج ۱ ص ۱۴۱) کہ تم میں سے کون شخص ایسا ہے جو اپنے نفس پر قابو پا سکتا ہے
یعنی تمہیں حیض اور روزہ کی حالت میں اپنی بیویوں کے ساتھ بوس و کنار بھی نہیں
کرنا چاہیئے کیونکہ تم اپنی طبیعت پر قابو نہیں پا سکو گے لہذا تمہیں اس سے بچنا
ہی چاہیئے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت عائشہؓ بحالت حیض لوگوں کو
مباشرت کی تلقین نہیں کرتی تھیں جیسا کہ برق صاحب نے شقاوتِ قلبی کا ثبوت
دیا ہے بلکہ وہ لوگوں کو منع کرتی تھیں۔ اتنی تصریح کے ہوتے ہوئے بھی اگر برق

صاحب اس حدیث میں مباشرت سے مجامعت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کو تعدیل مزاج کی سعی کرنی چاہیئے۔

برق صاحب ہی فرمائیں کہ حیض اور روزہ کی حالت میں بیوی کے بدن سے خاوند کے بدن ملنے اور چھو جانے سے یا عمدًا ایسا کرنے سے عقل کی کون سی دلیل پر زد پڑتی ہے؟ یا غریب میاں بیوی جن کے پاس ایک ہی چارپائی اور ایک ہی بستر ہے۔ کیا حیض اور روزہ کی حالت میں دن یا رات کو ایک جگہ نہیں سو سکتے؟ آخر عورت عورت ہے حیض کی حالت میں غیر انسان تو نہیں بن جاتی پھر کیوں برق صاحب اس کو نجس فرما رہے ہیں؟ اور مرد بھی تو آخر انسان ہے۔ وہ حیض اور روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کے بدن سے بدن ملانے کا کیوں اہل اور مستحق نہیں رہتا؟ اور معاشرتی اور خانگی زندگی کو سازگار اور پرلطف بنانے کے لیے شرعی حد میں رہتے ہوئے کیوں بوس و کنار نہیں کر سکتا؟ اور ایسی جائز دل لگی کرنے سے کون سی عقلی دلیل مانع ہے؟ ہاں یہ بات الگ ہے کہ اس حیض اور روزہ کی حالت میں جماع مطلقاً حرام ہے اور گھٹنوں سے ناف تک درمیان کا حصہ چھیڑنا جائز نہیں ہے اور حدیث میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام افراط و تفریط سے بچ کر مخلوق خدا کے سامنے جادۂ مستقیم پیش کرتا ہے نہ تو اسلام باطل قوموں کی طرح حیض کی حالت میں بیوی سے مجامعت کی اجازت دیتا ہے کیونکہ عورت کے لیے یہ خالص اذیت اور دکھ کا وقت ہوتا ہے اور نہ ہی یہود وغیرہ کی طرح اسے ناپاک اور نجس سمجھتا ہے کہ اُسے ہاتھ تک لگانا صحیح نہ ہو چنانچہ تورات میں اس کی تصریح ہے کہ اگر کسی عورت کو ایسا جریان ہو کہ اُسے حیض کا خون آئے تو وہ سات دن تک ناپاک رہے گی اور جو کوئی اُسے چھوئے وہ شام تک ناپاک رہے گا۔ اور جس چیز پر وہ اپنی ناپاکی کی

حالت میں سوئے وہ چیز ناپاک ہوگی اور جس چیز پر وہ بیٹھے وہ بھی ناپاک ہوجائے گی اور جو کوئی اس کے بستر کو چھوئے وہ اپنے کپڑے دھوئے اور پانی سے غسل کرے اور شام تک ناپاک رہے ۔اور جو کوئی اس چیز کو جس پر وہ بیٹھی ہو چھوئے وہ اپنے کپڑے دھوئے اور پانی سے نہائے اور شام تک ناپاک رہے (تورات احبار، باب ۱۵، آیت ۱۹ تا ۲۳)

یوں معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ برق صاحب کے نزدیک صحیح مسلمان دراصل یہودی اور عیسائی ہیں (جیسا کہ مقدمۂ کتاب میں ان کا حوالہ نقل کیا جاچکا ہے) اس لیے ان کے نزدیک صحیح تعلیم ہی ان کی ہے اور چونکہ یہود کی شریعت میں حیض وغیرہ کی حالت میں بیوی کے بدن سے بدن ملانا جائز نہیں اور خلاف تقویٰ ہے لہٰذا اس لیے برق صاحب اسلام میں بھی یہی سنّت رائج کرنا اور دیکھنا چاہتے ہیں اور حدیث مباشرت کا انکار بھی محض اسی ہی وجہ سے کیا جارہا ہے واللہ اعلم۔

تیسری شق کا جواب: شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ (المتوفی ۱۳۶۹ھ ۱۹۴۹ء) نے مطلق مباشرت کی تفصیل اور تشریح بیان کی ہے۔ انہوں نے اس مباشرت کی تفسیر نہیں بیان کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت ہے اور جس کا ذکر ویباشر کے جملہ سے کیا گیا ہے مگر برق صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک خاص قسم کی مباشرت کو فتح الملہم کی عبارت نقل کرکے (جو مطلق مباشرت سے متعلق تھی) عموم کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے العیاذ باللہ اور لکھا ہے کہ اس حدیث میں مباشرت سے کیا مراد ہے مولانا شبیر احمد عثمانی کی زبانی سنیے الخ

اس کی مثال ایسی ہی سمجھئے کہ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ زید نے جو پابند شرع ہے ایک کلام کیا ہے اور ایک دوسرا آدمی کلام کی تفصیل یوں کرتا ہے کہ کلام وہ ہوتا ہے جو زبان سے بولا جائے عام اس سے کہ وہ اچھا ہو یا بُرا سچ ہو یا جھوٹ

اچھائی کی تلقین ہو یا گالی گلوچ وغیرہ مطلق کلام کی تفسیر تو یہ ٹھیک ہے مگر کوئی ضدی یہ کہے اور اس پر اصرار کرے کہ زید نے تو گالی ہی دی ہے اور جس سے زید نے کلام کیا ہے وہ چلّا چلّا کر کہتا ہے کہ میرے ساتھ تو زید نے جائز کلام ہی کیا ہے گالی گلوچ اس میں شامل نہیں ہے مگر وہ ضدی ایک نہیں سنتا یہی حال ہے حدیث مباشرت کا حضرت عائشہؓ تو چلّا چلّا کر مباشرت کا ایسا معنیٰ بیان کرتی ہیں جو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کے شایان شان تھا اور حضرت عائشہؓ اپنی سرگزشت سناتی ہیں کہ ان ہی کے ساتھ [illegible] آتا تھا لیکن برق صاحب [illegible] مولانا عثمانی نے مباشرت کا لغوی معنی بیان کر [illegible] وقت [illegible] ذکر کرتے ہوئے ایک شرعی حکم بیان فرماتے ہیں کہ ناف سے اوپر اور گھٹنوں سے نیچے اگر [illegible] آلۂ تناسل عورت کے بدن سے مس کرے تو گناہ نہیں ہے مگر برق صاحب اس کا معنیٰ یوں کرتے ہیں کہ۔ اور آلۂ تناسل کا استعمال کر سکتے ہیں۔ ایک غلط اور بے بنیاد حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہاں آلۂ تناسل کا بدن سے مس کرنا اور چھو جانا اور کہاں آلۂ تناسل کا استعمال کرنا؟ ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے، برق صاحب محض اپنی طباعی کے زور سے صحیح چیز کو غلط ٹھہرانے اور بنانے کے درپے ہیں (نعوذ باللہ) ؎

مجھے حیرت ہے صاحب برق کی کوتاہ فہمی پہ
مآلِ جہل کو جو رقص پروانہ سمجھتے ہیں

چوتھی شق کا جواب: یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مباشرت کا حقیقی معنی الصاق البشرۃ بالبشرۃ (یعنی بدن کا بدن کے ساتھ ملنا) ہے اور کنایہ کے طور پر اس سے جماع بھی مراد ہو سکتی ہے قرآن کریم میں جس مباشرت کا ذکر کیا گیا ہے وہ مباشرت کا مجازی معنیٰ ہے یعنی جماع اور سیاق اور سباق اس کو متعین کرتا ہے اور برق صاحب کو بھی اس کا اقرار ہے اور حضرت عائشہؓ کی مذکور حدیث میں مباشرت سے حقیقی

معنیٰ مراد ہے یعنی بدن سے بدن کا ملنا اور مس کرنا جیسا کہ یملك اربه کا جملہ اور ناف سے گھٹنوں تک ، کا خوب تر کرانا اس کی واضح دلیل ہے اور ابو داؤد وغیرہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے نوجوان آدمی کو اس سے (یعنی بوس وکنار سے) منع کیا ہے کیونکہ نوجوان کا فتنہ میں مبتلا ہونا عجیب نہیں ہے اور برق صاحب کو اس کا اقرار ہے جب آیت میں مباشرت کا معنیٰ الگ ہے اور حدیث میں اس کا معنیٰ الگ اور جدا ہے تو حدیث کا قرآن سے تعارض پیدا کر کے حدیث پر ہوسِ نفسانی کے تحت طعن کرنا کہاں کا انصاف ہے ؟ مگر برق صاحب کو اس سے کیا غرض وہ تو ہر صحیح باب کا حلیہ بگاڑ کر اس سے مذاق اڑانے کے درپے ہوتے ہیں جس کے جواب کی ضرورت پڑتی ہے اور حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے آخر ؎

اسی سے ہوگا اک دن جلوۂ علم نبی پیدا

پانچویں شق کا جواب :- جس مباشرت کی قرآن کریم رات کو اجازت دیتا ہے وہ مجامعت کے معنیٰ میں ہے اور جس مباشرت کی حدیث مذکور دن اور رات کو کھلی چھٹی دیتی ہے وہ مباشرت جماع کے علاوہ بوس وکنار ہے جس کی تفصیل پیش کی جا چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے جب دونوں کا مفہوم الگ الگ ہے تو پھر تعارض کا کیا معنیٰ ؟۔

چھٹی شق کا جواب :- برق صاحب کا یہ دعویٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر فعل امت کے لیے واجب التقلید ہے غلط ہے کیونکہ بعض فعل صرف آپ کی خصوصیات میں شامل تھے مثلاً بیک وقت چار سے زیادہ بیبیوں سے نکاح کرنا اپنی چچازاد اور پھوپھی زاد بہنوں میں سے صرف اُن کے ساتھ نکاح کرنا جو ہجرت اختیار کر چکی ہیں وغیرہ وغیرہ اور برق صاحب کے نزدیک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں کسی بی بی سے مجامعت نہیں کی تھی (جیسا کہ بیان

کیا جا چکا ہے) حالانکہ زیادہ شادیاں آپ نے مدینہ طیبہ میں ہی کی تھیں تو آپ کا یہ فعل بھی
برق صاحب وغیرہ کے لیے واجب التقلید ہے اس لیے امتی شادی تو کریں مگر
مجامعت کے قریب بھی نہ جائیں ورنہ آپ کے فعل کی مخالفت لازم آئے گی علاوہ ازیں
کیا ڈاڑھی رکھنا آپ کا فعل نہیں؟ اور اس قسم کے دیگر سینکڑوں افعال میں آپکی تقلید کو برق صاحب
کیوں پسند نہیں کرتے؟ اور برق صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک
فعل اور سنت کی ہاتھ دھو کر کیوں مخالفت کر رہے ہیں؟ کیا آپ کے ہر ہر فعل کے امت
پر واجب التقلید ہونے کا یہی مطلب ہے کہ ورقوں کے ورق اور صفحات کے
صفحات ان کی مخالفت میں سیاہ کر دیئے جائیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا
صحیح شیدائی آپ کے نقش قدم پر چلنے کو اپنے لیے باعث نجات اور قابلِ صد افتخار سمجھتا
ہے کیونکہ ؎

خود یہ آواز بھی ہے صاحب آواز بھی ہے
نغمۂ دِل کی صدا سوز بھی ہے ساز بھی ہے

ساتویں شق کا جواب:۔ یہ برق صاحب کا خالص جھوٹ اور سفید بہتان ہے کہ
امام بخاریؒ و مسلمؒ نے گھٹنوں سے نیچے استعمال آلت کی اجازت دی ہے حاشا و کلا
امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے کہیں ایسا نہیں لکھا گھٹنوں سے نیچے بدن کے کسی حصہ
سے آلۂ تناسل کے مس کرنے اور چھو جانے کا ذکر مولانا عثمانیؒ نے اپنی شرح میں کیا
تھا ان کی تشریح کو امام بخاریؒ و مسلمؒ کے ذمہ لگا دینا انتہائی قبیح امر ہے۔ علاوہ ازیں
مولانا عثمانیؒ نے بھی مس ذکر کی اجازت تو دی ہے لیکن استعمال آلت کی اجازت
ہرگز نہیں ہے۔

آٹھویں شق کا جواب:۔ دیکھئے کہ برق صاحب کس جرأت اور بے باکی سے
محدثین کرامؒ پر یہ بے بنیاد الزام اتنک صریح اور بہتان باندھتے ہیں کہ انہوں نے اس

فعلِ لذیذ کے لیے ایک سے ایک بڑھیا حدیث گھڑی ہے محدثین کرامؒ کا دامن اس باطل الزام سے یقیناً پاک ہے وہ تو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کو محفوظ کر کے اس پر مر مٹنے پہ تیار رہتے تھے۔ اور غیر کی بات کو آپ کی طرف منسوب کرنے کو گناہ عظیم سمجھتے تھے اور جس وجہ سے برق صاحب اس کو موضوع اور جعلی قرار دیتے ہیں اس کی حقیقت صرف یہود اور نصاریٰ کی ہمنوائی ہے۔

نویں شق کا جواب:۔ برق صاحب نے امام ابو داؤدؒ کے حوالہ سے جو روایت روزہ کی حالت میں زبان چوسنے کی نقل کی ہے وہ نہایت کمزور ہے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن دینار اور سعد بن اوس ضعیف اور کمزور ہیں اور علامہ ابن الاعرابیؒ خود امام ابوداؤد ہی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں۔ ھذا الحدیث غیر صحیح (نصب الرایہ ج۲ ص۲۵۳) امام ابو داؤدؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے لہذا اس ضعیف حدیث کو لے کر صحیح احادیث سے تعارض قائم کرنا اور پھر ان کا انکار کرنا نری بے دینی اور خالص زندقہ ہے۔

دسویں شق کا جواب:۔ مباشرت وغیرہ کے شرعی احکام کی روایات صرف حضرت عائشہؓ سے ہی مروی نہیں ہیں دیگر صحابہ کرامؓ صحابیاتؓ اور ازواج مطہراتؓ سے بھی مروی ہیں برق صاحب کو وسعت مطالعہ کی کوشش کرنی چاہیئے اور احادیث کی کتابوں میں دیکھ لینا چاہیئے کہ کیا دیگر صحابہ کرامؓ سے بھی اس قسم کی روایتیں منقول ہیں یا نہیں؟ علاوہ ازیں یہ بھی مت بھولیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تقریباً پچاس سال تک حضرت عائشہؓ زندہ رہی ہیں اور اپنی ذہانت اور فطانت اور خداداد قابلیت کی وجہ سے جو روایات انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کی تھیں وہ بیان کرتی رہیں اور انہوں نے دین کی بڑی خدمت کی ہے ان اوصاف میں کوئی اور زوجہ مطہرہؓ یا صحابیہؓ آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

حضرات! یہ ہیں وہ وزنی اور سنگین اعتراضات جو برق صاحب نے جناب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث پر وارد کئے ہیں کہیں مرفوع حدیث کو موقوف بنا دیا ہے اور کہیں اس کا عکس کہیں ناسخ اور منسوخ میں تعارض قائم کیا ہے اور کہیں اپنی طرف سے حدیث میں الفاظ ڈالے اور کہیں حذف کر دیے ہیں کہیں معنی اور مراد کو بدل ڈالا ہے اور کہیں دعائیہ جملہ کو قرآن کریم کی آیت تصور کر لیا ہے اور کہیں ایسی دو حدیثوں کو آپس میں متعارض سمجھ بیٹھے ہیں جن میں درحقیقت کوئی تعارض نہیں ہے اور آپ یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ جو اعتراض حدیث پر کئے گئے ہیں وہ صرف حدیث پر ہی وارد نہیں ہوتے بلکہ قرآن کریم بھی ان کی زد سے محفوظ نہیں رہتا برق صاحب تو صرف حدیث کا رونا رو رہے ہیں لیکن یہاں تو خیر سے قرآن کریم کی بھی خیر نہیں (معاذ اللہ) ع

دہن کا ذکر کیا یاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

جب آپ کو برق صاحب کے بڑے اہم اور وزنی اعتراضات کی حقیقت معلوم ہوگئی جن کو دواسلام کی جان اور روح کا درجہ حاصل ہے تو اسی سے آپ دوسرے اعتراضات کی حقیقت بخوبی سمجھ سکتے ہیں ع

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

اب ہم برق صاحب کا صرف ایک اعتراض نقل کر کے اس کا جواب عرض کرتے ہیں اور یہ اعتراض صرف ایک ہی حدیث پر وارد نہیں ہوتا بلکہ اس کی زد میں حدیث کا سارا ذخیرہ آتا ہے اور منکرین حدیث مختلف اسالیب سے پیش کر کے انکار حدیث کے لیے اسے سنگ بنیاد سمجھتے اور اس پر اپنے ناپاک دعویٰ کی تعمیر رکھتے ہیں۔

برق صاحب کا حدیث پر چھتیسواں ۳۶ اعتراض

برق صاحب لکھتے ہیں۔

عن ابی سعید الخدریؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تکتبوا

عنی ومن کتب عنی شیئاً غیر القرآن فلیمحہ (صحیح مسلم) ابی سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا قرآن کے بغیر میرا کوئی اور قول قلمبند نہ کرو اگر کوئی شخص ایسا کوئی قول لکھ چکا ہو تو اسے مٹا دے۔ اور اس حکم کی دو وجہیں تھیں۔

اوّل کہ کہیں غلطی سے احادیث قرآن کے متن میں شامل نہ ہو جائیں بعض گذشتہ انبیاء کے الہامی صحائف میں ان کی احادیث بھی شامل ہوگئی تھیں اور کتاب الٰہی کا حلیہ بگڑ گیا تھا، دوم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی میں اُن کے اقوال محرّف ہو چکے تھے اور یہ ہے بھی ایک فطری چیز آدمی کو اپنی کہی ہوئی بات تک یاد نہیں رہتی وہ دوسرے کی کیا یاد رکھ سکتا ہے الخ۔ (دو اسلام ص ۷۹ طبع اوّل و ص ۵۵ طبع ششم بلفظہٖ) برق صاحب نے اپنے اس مزعوم کو ثابت کرنے کے لیے کئی صفحات اس پر سیاہ کر دیے ہیں مگر کوئی نقلی یا عقلی صحیح دلیل اس پر وہ پیش نہیں کر سکے۔

جواب: ہم چند امور عرض کر دیتے ہیں جن سے آپ کو اس اعتراض کا صحیح اور تسلی بخش جواب مل جائے گا۔ (ا) ابتدائے اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے منع کر دیا تھا تاکہ احادیث قرآن کے متن میں شامل نہ ہو جائیں اور منع کی اس علّت اور وجہ کا برق صاحب کو خود بھی اقرار ہے جیسا کہ درج کیا جا چکا ہے۔ (۲) یہ ممانعت عارضی اور وقتی تھی بعد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے لکھنے کی اجازت دیدی تھی اور متعدد[1]

---

[1] امام نوویؒ نقل کرتے ہیں کہ تابعینؒ کے زمانہ میں کتابت حدیث کے بارے میں اختلاف تھا بعض حضرات لکھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے (ہاں بیان ضرور کرتے تھے) اور اکثریت کتابتِ حدیث کے جواز کی قائل تھی پھر آگے لکھتے ہیں:۔

ثم اجمع المسلمون علی جوازها وزال ذالك الخلاف (نووی ج ۲ ص ۴۱۴)

پھر تمام مسلمانوں کا جواز پر اتفاق ہوگیا اور اختلاف ختم ہوگیا۔

صحابہ کرامؓ نے حدیثیں قلمبند کر لی تھیں، جن میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ حضرت انسؓ حضرت ابو شاہ یمنیؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور ان کے علاوہ بے شمار صحابہ کرامؓ نے بیسیوں ہی نہیں بلکہ سینکڑوں حدیثیں قلمبند کی تھیں اس کی مفصّل تحقیق راقم السطور کی کتاب شوق حدیث میں ملاحظہ کیجیے خوف طوالت سے ہم حوالوں کو نظر انداز کرتے ہیں (۳) اگر برق صاحب دیانت سے کام لیتے اور پوری حدیث نقل کر دیتے تو شاید سامعین کو غلط فہمی پیدا نہ ہوتی مگر کیا کرتے وہ اپنی عادت سے مجبور ہیں اس حدیث میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں۔ وحدثوا عنّی ولا حرج ومن کذب علیّ متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار (مسلم ج ۲ ص ۴۱۴) اور میری حدیث بیان کیا کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور جس نے مجھ پہ دیدہ دانستہ جھوٹ بولا وہ دوزخ میں اپنا ٹھکانا بنا لے۔

اس حدیث کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے کتابت حدیث سے منع کیا تھا نہ کہ بیان حدیث سے اگر مطلقاً حدیث حجت نہ ہوتی تو آپ صاف فرما دیتے کہ میری حدیث قطعاً حجت نہیں ہے کوئی آدمی اس کو بیان کرنے کی زحمت گوارا نہ کرے اور نہ اپنا وقت ضائع کرے اور آپ کی احادیث کوئی افسانہ تو تھیں نہیں بلکہ آپ جو کچھ فرمایا کرتے تھے اصلاحِ عقائد اخلاق معاملات اور اقتصادی و معاشرتی زندگی کو درست اور بہتر بنانے کے لیے ہی فرمایا کرتے تھے[1] لہذا احادیث کو بیان کرنا وسیلہ اور

---

[1] اسی لیے ۱۰ ذوالحجہ ۱۰ھ کو جب کہ ہزاروں نفوس قدسیہ حاضر خدمت تھے ایک بلیغ خطبہ دینے کے بعد بطور تاکید آپ نے فرمایا فلیبلغ الشاھد الغائب (بخاری ج ۱ ص ۱۶) کہ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میری باتیں اور حدیثیں ان لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔

ان پر عمل کرنا اصلی مقصود ٹھہرا، اس سے بڑھ کر حجیت حدیث کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔ ۴۔ اگر لکھی ہوئی احادیث کا وقتی طور پر مٹا دینا عدم حجیت حدیث کی دلیل ہوتا جیسا کہ برق صاحب اور ان کے ہمنوا دوست سمجھے بیٹھے ہیں تو دیگر صحابہ کرامؓ عموماً اور حضرت ابوسعیدؓ الخدریؓ (جو اس روایت کے راوی ہیں) خصوصاً ایک حدیث بھی بیان نہ کرتے لیکن دیگر صحابہؓ نے بھی اور خود حضرت ابوسعیدؓ الخدریؓ نے بھی ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں[1] روایتیں بیان کی ہیں جو کتب حدیث میں درج ہیں برق صاحب مسند احمد اور مسند طیالسی میں ہی ان کی روایات دیکھ لیں کہ کتنی ہیں؟ بلکہ ابوسعیدؓ الخدریؓ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ۔

مذاکرۃ الحدیث افضل من قرأۃ القرآن (تدریب الراوی ص۱۸۰)

حدیث کا آپس میں تکرار کرنا تلاوت قرآن کریم سے بھی افضل ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ تلاوت قرآن کریم گو بڑے درجہ اور فضیلت کی حامل ہے لیکن ہے تو بہر حال ایک لازمی عبادت اور مذاکرۃ حدیث میں افہام و تفہیم کے ذریعہ دوسروں کو فائدہ ہوتا ہے جو ایک متعدی عبادت ہے جس کے افضل اور اعلیٰ ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے؟ علاوہ بریں قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ تو خود اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے اس کے ضائع ہونے کا کوئی خطرہ نہیں وہ خود اس کی حفاظت اور نگرانی کے اسباب پیدا کرتا رہے گا۔ لیکن ابوسعیدؓ الخدریؓ کے خیال میں حدیث کا مذاکرہ اس کے احیاء کے لیے نہایت ضروری تھا تاکہ وہ مٹ نہ جائے چنانچہ امت نے اپنے پیارے رسول کی پیاری حدیثوں کی ایسی حفاظت کی کہ دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے صرف عاجز ہی نہیں بلکہ ان کی خدمت جلیلہ کی مداح بھی ہے۔

---

[1] حضرت ابوسعیدؓ الخدریؓ سے کل ۱۱۷۰ حدیثیں مروی ہیں (بحوالہ اسوۂ صحابہ ج ۲ ص۲۳۲ وغیرہ)

ع والفضل ما شهدت به الاعداء

حضرت ابو نضرہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو سعید الخدریؓ سے دریافت کیا کہ ہم جو حدیثیں آپ سے حاصل کرتے ہیں ان کو نہ لکھ لیا کریں؟ فرمایا ان نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم کان یحدثنا فنحفظ فاحفظوا کما کنا نحفظ۔ (جامع بیان العلم ص۳۲) کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حدیثیں بیان کیا کرتے تھے اور ہم ان کو یاد کر لیا کرتے تھے۔ تم بھی (بجائے لکھنے کے) اسی طرح حدیثوں کو زبانی یاد کرو جیسے ہم یاد کرتے تھے۔ (۵) جو لوگ حافظہ کے لحاظ سے ساری دنیا میں اپنا نظیر نہ رکھتے ہوں۔ جن کو گدھوں اور گھوڑوں تک کے نسب نامے یاد ہوں ایک دو نہیں بلکہ ہزاروں اشعار اور قصائد انہوں نے قرناً بعد قرن زبانی یاد رکھے ہوں اس قوم کے متعلق یہ نظریہ اور رائے قائم کر لینا کہ انہوں نے اپنے محبوب پیغمبر کی باتوں اور حدیثوں کو فراموش کر دیا ہوگا۔ اور پرواہ نہ کی ہوگی۔ کس قدر حقائق سے پہلو تہی اور سینہ زوری کا بیّن ثبوت ہے غرضیکہ جن لوگوں کا حافظہ ضرب المثل اور اپنے رسول کے ساتھ عشق صادق ہو ان کے متعلق یہ نظریہ قائم کر لینا خالص بہتان اور سراسر افتراء ہے اور بس۔ ۶۔ برق صاحب نے کس معصومانہ انداز میں یہ لکھ دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی میں ان کے اقوال محرّف ہو چکے تھے۔ نہ تو اس کے ثبوت پر صحیح احادیث سے کوئی مثال نقل کرنے کی تکلیف فرمائی اور یہ نہ بتلایا کہ تحریف صحابہ کرامؓ نے کی تھی یا منافقوں اور مرتدوں نے؟ نیز یہ بھی واضح نہ کیا کہ ان محرّف اقوال کو صحابہ کرامؓ اور محدثینؒ نے ٹھکرا دیا تھا۔ یا اپنی کتابوں میں ان کو بھی درج کر لیا تھا؟ اور اگر ان محرف اقوال کو امّت کے سامنے نقل کیا تو اس لیے کہ ان کو مغالطہ نہ ہو جائے یا اس لیے کہ ان پر عمل کر کے وہ ثواب دارین حاصل کریں؟ محض اپنی دنیوی خواہش کو پورا کرنے کے لیے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کرامؓ کے پاک نفوس

پر ایسا حملہ کرنا کتنی جسارت اور جرأت کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے گستاخوں اور بے ادبوں سے محفوظ رکھے۔ آمین ثم آمین ع

بے ادب محروم ماند از فضل رب

ہم نے برق صاحب کے جملہ وزنی اعتراضات کے جوابات عرض کر دیے ہیں اور ان کے ذہن میں احادیث کے انکار کرنے کے بعد جو ماحول پیدا کرنے کا تصور اور خیال تھا وہ بحمد اللہ کافور ہو جائے گا۔ اگر وہ برا نہ مانیں تو ایک جائز ورد اور وظیفہ ان کو عرض کر دیا جائے جس کو وہ پڑھا کریں وہ یہ ہے ؎

اے میرے باغ آرزو کیسا ہے باغ ہار تو　　کلیاں تو گو ہیں چار سو کوئی کلی کھلی نہیں

خاتمہ

ہمارے خیال میں یہ کسی طرح قرین انصاف نہیں کہ ہم برق صاحب کی دیگر علمی تاریخی اور تنقیدی تحقیق و تدقیق سے آپ کی ضیافت طبع کا سامان نہ کریں اگرچہ جو گوہر افشانی انہوں نے دو اسلام میں کی ہے وہ بہت زیادہ ہے ہم سب کچھ عرض کرنے سے تو یقیناً قاصر ہیں۔ لیکن مشہور ہے کہ مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ۔ (یعنی اگر سب کا کچھ نہ ہو سکے تو سب کچھ چھوڑا بھی نہیں جا سکتا) اس لیے ہم چند نمونے عرض کر دیتے ہیں ملاحظہ کیجیے۔

حوالہ نقل کرنے میں خیانت کرنا۔

۱۔ علامہ ذہبیؒ تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا ہوا تھا (ظاہر ہے کہ حضرت صدیق کے مجموعے سے زیادہ قابلِ اعتماد اور کون سا مجموعہ ہو سکتا تھا) لیکن ایک صبح اُٹھ کر اُسے جلا دیا (انتہیٰ بلفظہٖ دو اسلام طبع اوّل ص۴۲ و ص۵۱ طبع ششم)

جواب:۔ اوّلاً۔ اس جگہ بھی برق صاحب نے خیانت کا ثبوت دیا ہے۔ اس روایت کے نقل کرنے کے بعد علامہ ذہبیؒ لکھتے ہیں۔ فہذا لا یصح (تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۵) یہ روایت صحیح نہیں ہے اور تذکرہ کے بعض مطبوعہ نسخوں میں فہذا لا یصلح ہے یعنی یہ روایت استدلال کے لیے صلاحیت نہیں رکھتی، چونکہ علامہ ذہبیؒ کا روایت مذکورہ کے متعلق فیصلہ مخالف پڑتا تھا۔ اس لیے برق صاحب نے اس کو نقل کرنے کی تکلیف نہ فرمائی تاکہ قلعی نہ کھل جائے۔

وثانیاً۔ اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے واقعی ایسا کیا ہوتا اور ان کے نزدیک احادیث حجت نہ ہوتیں تو وہ ایک حدیث بھی بیان نہ کرتے حالانکہ ان سے متعدد حدیثیں مروی ہیں۔ اگر ان کی دیگر احادیث سے قطع نظر کر کے صرف یہی پیش نظر رکھا جائے کہ وراثت جدہ کے متعلق ابوبکر صدیقؓ نے صحابہ کرامؓ سے دریافت کیا کہ کسی کو حدیث معلوم ہے تو بتلایئے محمدؓ بن مسلمہ اور مغیرہؓ بن شعبہ نے حدیث بیان کی۔ اور صدیقؓ نے خلافت سنبھالنے کے بعد خود حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے مال متروکہ میں قانون وراثت کے جاری نہ ہونے پہ روایت اور حدیث نحن معاشر الانبیاء لا نورث پیش کی اور صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق کیا تھا (بخاری ج ۲ ص ۹۹۵ وغیرہ) کیا اس سے حدیث رسولؐ کا واجب العمل ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ اگر یہ اثبات حجیت حدیث کے لیے نہ تھا تو برق صاحب ہی انصاف سے فرمائیں کہ کس لیے تھا؟

وثالثاً۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب مجھے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بحرین کا عامل بنا کر روانہ کیا تو زکوٰۃ کے نصاب کے متعلق وہ پوری تفصیل جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے انہوں نے اخذ کی تھی مجھے لکھ کر دی۔ بخاری ج ۱ ص ۱۹۵ وغیرہ میں وہ پوری روایت موجود ہے۔ اگر حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک حدیث حجت نہ ہوتی اور اس کا لکھنا گناہ ہوتا تو اپنے گورنر کو حدیث رسولؐ کبھی لکھ کر نہ دیتے افسوس ہے کہ منکرین حدیث ایسی احادیث سے آنکھیں بند کر کے نہایت کمزور اور غیر صحیح روایت سے استدلال کرتے ہیں۔

ورابعاً۔ تذکرۃ الحفاظ کی روایت نہایت ضعیف اور کمزور ہے ایک تو اس میں علی بن صالح مدنی ہے جو مجہول ہے۔ (تقریب ص ۲۷۲) اور دوسرا راوی اس کڑی کا موسیٰ بن عبداللہ بن حسن بن حسن ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں فیہ نظر (میزان ۳ ص ۲۱۳) محدثینؒ کے نزدیک اس میں کلام ہے اور علامہ سیوطیؒ تصریح کرتے

ہیں کہ جس راوی کے بارے میں امام بخاریؒ فیہ نظر اور سکتوا عنہ کہتے ہیں محدثین کرامؒ کے ہاں اس کی روایت بالکل متروک ہوتی ہے (تدریب الراوی صـ۲۳۵ طبع مصر)

ایک مشہور صحابی کے نام میں غلطی کرنا۔

۲۔ حضور نے ایک صحابی ہزالؓ نامی پہ زنا کی حد جاری کی تھی (انتہی بلفظہٖ دو اسلام طبع اوّل صـ۴۵ اور اب ششم میں ہزالؓ کا نام حذف کر دیا ہے)۔

جواب ا۔ یہ بھی برق صاحب کی شاید کوئی جدید یا الہامی تحقیق ہو گی ورنہ ہزالؓ پہ آپؐ نے زنا کی حد جاری نہیں کی تھی اور نہ انہوں نے اس جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ حضرت ماعزؓ نے ہزال اسلمیؓ کی لونڈی سے زنا کیا تھا جب ہزال کو پتہ چلا تو انہوں نے ماعزؓ کو اس بات پہ آمادہ کیا کہ تم نے جرم کر کے اپنی آخرت ضائع کر دی ہے تم جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اقرار جرم کرو تاکہ حضور تیرے لیے دعا کریں اور تم اُخروی سزا سے بچ جاؤ۔ چنانچہ حضرت ماعزؓ نے اقرار کر لیا اور یہ سزا ثبوت کے بعد محض توبہ سے معاف ہونے والی نہ تھی اس لیے حضرت ماعزؓ پہ رجم (سنگسار کرنے) کی سزا جاری کی گئی (دیکھئے ابوداؤد وغیرہ) بات کیا تھی اور برق صاحب کے اجتہاد نے اُسے کیا بنا دیا ہے۔

صحابہ کرامؓ پر اتہام

۳۔ صحابہ کرامؓ کے اختلافات کا ذکر کر کے آگے لکھا ہے کہ ان حالات میں بالکل ممکن ہے کہ کسی صحابیؓ نے بھی عمداً کسی حدیث کے الفاظ بدل دیئے ہوں اور سہو

لہ ایک موقع پر حضرت امیر معاویہؓ نے لوگوں کو جمع کر کے واہی روایات کے بیان کرنے سے منع کیا تھا۔ لیکن برق صاحب نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر ان لوگوں کو (جو اکثر بلکہ نوّے فیصدی غیر صحابی تھے) صحابیؓ قرار دیکر یہ لکھا ہے صحابہؓ میں کافی تعداد ایسے حضرات کی تھی جو محرف احادیث بیان کرنے کے خوگر تھے (بلفظہٖ دو اسلام صـ۹۸ طبع اول وصـ۱۱۲ طبع ششم

ونسیان کا خطرہ تو ہر وقت تعاقب میں رہتا تھا۔ (انتھی بلفظہٖ دو اسلام ص۵۴ طبع اوّل وص۶۱ طبع ششم) اور حضرت انس رضؓ کے متعلق لکھا ہے کہ ممکن ہے کوئی ارشاد بالفاظہٖ یاد رہا ہو اور بعض کا خاکہ خود مکمل کر لیا ہو۔ بہر حال جو احادیث آپ سے مروی ہیں اُن کی تعداد ۲۲۸۶ ہے جن میں ۱۶۸ کی صحت پر آئمہ حدیث کا اتفاق ہے۔ اور باقی ۱۱۱۸ کو ناقابل توجہ سمجھا جاتا ہے۔ الخ (بلفظہٖ دو اسلام ص۷۲ طبع اول وص۸۸ طبع ششم)

جواب: حضرت صحابہ کرامؓ چونکہ معصوم تو تھے نہیں اس لیے اگر کسی سے سہو اور نسیان کی حالت میں کسی حدیث کا کوئی لفظ بدل گیا ہو تو ہو سکتا ہے اور اس پر قرآن کریم کی رُو سے ان کو کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ لیکن صحابہؓ کے متعلق یہ نظریہ کہ عمداً کسی صحابی نے حدیث کے الفاظ بدل دیئے اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ لفظ بدل دیا لیکن معنیٰ نہیں بدلا مراد سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی محفوظ رکھ کر صرف تعبیر بدل دی ہے تو اس صورت میں کیا نقص ہے؟ الفاظ سے معنیٰ ہی مقصود ہوتا ہے جب وہ محفوظ ہے تو عبارت کے بدلنے میں کوئی حرج نہیں، ہاں اگر یہ مراد ہے کہ معنیٰ بھی بدل ڈالا اور اپنی طرف سے خاکہ مکمل کر لیا ہو تو یہ اُن پر خالص افترا اور بہتان ہے اور افک عظیم کا مصداق ہے اور کتنی بڑی جسارت ہے کہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا قطعی فیصلہ صادر فرماتا ہو اور ان کو اپنی رضا کی سند دیتا ہو وہ ایسی قبیح حرکات پر اُتر آئیں کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے عمداً الفاظ بدلتے پھریں بالخصوص جب کہ متواتر درجہ کی حدیث سب سے پہلے ان کے علم میں آچکی تھی کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف عمداً جھوٹ کی نسبت کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔ عیاذاً باللہ۔ شاید برق صاحب نے صحابہ کرامؓ کو اپنی ذات پر قیاس کر لیا ہے کہ وہ بھی اسی طرح کا خاکہ تیار کر لیتے ہوں گے۔ جیسے برق صاحب محدثین کرامؒ کی اصطلاح میں متفق علیہ

صرف وہ حدیث ہوتی ہے جس کو بخاریؒ اور مسلمؒ نے اپنی اپنی صحیح میں ایک ہی صحابی سے روایت کیا ہو اور حضرت انسؓ کی وہ حدیثیں جو اس اصطلاحی متفق علیہ کے تحت درج ہیں ان کی تعداد ۱۶۸ ہے اور ان کی دیگر روایات جو اصطلاحی متفق علیہ نہیں ہیں صحاح ستہ وغیرہ کی باقی کتب حدیث میں مروی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ برق صاحب کو محدثینؒ کی متفق علیہ اصطلاح کا بھی علم نہیں ہے جس سے انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ حضرت انسؓ کی باقی ۲۱۱۸ حدیثیں بالکل ناقابلِ اعتبار ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ؎

وکم من عائب قولا صحیحا

وآفتہ من الفہم سقیم

حضرت امام بخاریؒ پر بہتان

۴۔ ان مشتبہ گوش بریدہ اور خود تراشیدہ احادیث کا سیلابِ عظیم جب حضرت امام بخاریؒ کے دور میں داخل ہوا تو آپ نے چھ لاکھ احادیث میں سے جو آپ کو یاد تھیں صرف ۷۲۷۵ انتخاب کیں اور باقی کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا (بلفظہٖ دو اسلام ص۴۵ طبع اول و ص۶۱ طبع ششم لیکن اس میں بجائے ردّی کی ٹوکری الخ کے یہ لکھ دیا ہے کہ ناقابلِ اعتماد قرار دیا)

جواب:۔ برق صاحب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ شاید حدیث کے متون چھ لاکھ (یا اس سے زیادہ) تھے۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ محدثین کی یہ اصطلاح ہے کہ اگر متن ایک ہو اور اس کو روایت کرنے والے مثلاً سو ہوں تو ان کی اصطلاح میں سو حدیثیں ہوں گی۔ اگر سند میں کہیں سے ایک راوی بھی نیا آجائے تو وہ نئی حدیث سمجھی جائے گی۔ اس کی بحالا مزید علیہ بحث راقم الحروف کی کتاب شوقِ حدیث میں ملاحظہ کیجئے۔ برق صاحب کا یہ کہنا کہ امام بخاریؒ نے ۷۲۷۵ احادیث کے علاوہ باقی سب کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا یا ناقابل اعتماد قرار دیا تھا۔ بالکل سفید جھوٹ ہے۔ امام بخاریؒ کی صحیح بخاری کے علاوہ اکیس عدد

سایں اور (دیکھئے مقدمہ ادب المفرد ص۲ وغیرہ) اور وہ ان میں ان احادیث سے باقاعدہ استدلال کرتے ہیں جن کو انہوں نے صحیح بخاری میں درج نہیں کیا۔ اگر برق صاحب کو امام بخاری کی المسند الکبیر اور الجامع الکبیر دستیاب نہیں ہوسکتیں تو خلق افعال العباد اور ادب المفرد وغیرہ تو آسانی سے مل سکتی ہیں ان کا مطالعہ کرکے انصاف سے فرمائیں کہ وہ ان احادیث کو جو صحیح بخاری میں درج نہیں کیں صحیح سمجھ کر ان سے احتجاج کرتے ہیں یا ردی کی ٹوکری میں پھینک رہے ہیں اور ناقابلِ اعتماد قرار دے رہے ہیں۔

لفظ زی اور ذی میں فرق نہ کرنے کا شاخسانہ

۵۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایاکم و ذی الاعاجم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ تم لوگ اہل عجم سے بچ کر رہو اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایرانیوں سے دور رہنے کی ہدایت فرمائی تھی تو آپ نے ان پر چڑھائی کیوں کی؟ ان کی سلطنت کو کیوں تہ وبالا کیا الخ (بلفظہٖ دو اسلام ص۱۴۷ طبع اول اور اب ندارد)

جواب: یہ حدیث قوی ہے یا ضعیف؟ صحیح ہے یا جعلی؟ ہمیں اس وقت اس سے کوئی سروکار نہیں ہم جو کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اصل میں روایت یوں ہے۔ ایاکم وزی الاعاجم۔ اے مسلمانو! تم اہل عجم (یعنی کفار) کے لباس شعار اور بھیس سے بچو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے مسلمانوں کو اہل عجم (جو اس وقت تقریباً سبھی کافر تھے) کے شعار اور وضع قطع کے اختیار کرنے سے منع کیا تھا۔ برق صاحب ہی فرمائیں کہ جب کہ وہ بڑے آزاد فطرت اور روشن خیال واقع ہوئے ہیں (جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں اور نہ میری آزاد فطرت فرقہ پرستی اور گروہ بندی کا تصور تک بھی برداشت کر سکتی ہے۔ حاشیہ دو اسلام ص۲۷۷ طبع اوّل و ص۲۸۱ طبع ششم اور الفاظ یہ ہیں اور نہ میں فرقہ پرستی اور گروہ بندی کا تصور تک بھی برداشت کر سکتا ہوں) کیا وہ

ہندوؤں کی طرح سر پہ چوٹی رکھنا گلے میں مالا ڈالنا ماتھے پہ تلک لگانا اور خاص وضع کی ہندوانہ دھوتی باندھنا پسند کرتے ہیں؟ مُلّا تو بڑا تنگ نظر اور تنگ ظرف واقع ہوا ہے وہ تو اس کو کبھی گوارا نہ کرے گا مگر برق صاحب کی فطرت ماشاء اللہ بڑی آزاد واقع ہوئی ہے ان کو اس سے کیا چیز مانع ہے اور کیا برق صاحب سکھوں کی مانند سر پہ بالوں کا جوڑا رکھنا ہاتھ میں کڑا پہننا اور بدن کے کسی حصہ کے بالوں کو نہ چھیڑنا وغیرہ برداشت کر لیں گے؟ آخر برق صاحب آزاد منش اور آزاد فطرت آدمی ہیں ان کو اس سے کیا باک ہے؟ اور کیا برق صاحب ڈاڑھی رکھ کر بقول خود گرو گوبند سنگھ کی امت بننا گوارا کریں گے والعیاذ باللہ (دیکھیے جہان نو ص۲۲) اگر وہ ایسا کرنے پر رضامند نہیں ہیں تو بتلائیں کہ اگر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے بھیس، لباس، شعار اور فیشن کے اختیار کرنے سے منع کیا ہے تو اس میں کیا خرابی ہے؟ برق صاحب نے اس حدیث میں پہلے یہ جہاد کیا ہے کہ زِیّ کو ذی سے بدلا ہے (یا یوں ہی کہیں سے غلط نقل کیا ہے) اور پھر اس پر اعتراض کی عمارت قائم کی ہے۔ علامہ محمد طاہر الحنفیؒ لکھتے ہیں

ایاکم وزی العجم بکسر زاءٍ میرید الحث علیٰ خشونة العیش ومحافظة طرائق العرب بلفظہٖ (مجمع البحار ج۲ ص۹۷) زِیّ کا لفظ زاء کے کسرہ سے ہے آپ نے امت کو جفاکشی پہ آمادہ کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ عرب کے طور وطریق کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ اگر یہ لفظ ذو ہوتا جیسا کہ برق صاحب سمجھے بیٹھے ہیں تو گرامر کے لحاظ سے عبارت یوں ہونی چاہیئے تھی۔ ایاکم وذوی العجم جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ایرانیوں پر حملہ ہوا اور ان پہ چڑھائی کی گئی تھی۔ مگر شاید یہ عقدہ برق صاحب ہی حل فرمائیں گے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایرانیوں پہ حملہ اور چڑھائی کی تھی؟ آخر محقق وقت کی بات ہے، بلاوجہ تو نہ ہو گی تاریخ نہ بتلائے یا ہم نہ سمجھ سکیں تو برق صاحب کی تحقیق پر اس سے کیا زد آتی ہے؟

حضرت ابن عمرؓ اور ابن عمروؓ میں فرق نہ کرنا

۶۔ حضرت ابن عمرؓ اور عبداللہؓ بن عمروؓ بن العاص برقؔ صاحب کے نزدیک ایک ہیں (دیکھیے دو اسلام صفحہ ۷۰، ۷۱، ۸۱، ۷۷، ۱۸۷، ۱۸۸ طبع اوّل وص۸۶ وغیرہ طبع ششم)

حضرت انسؓ کی عمر بتانے میں غلطی کرنا۔

۷۔ حضرت انسؓ بن مالک کی عمر جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم مدینہ طیّبہ تشریف لے گئے تھے پورے دس برس کی تھی (دیکھیے اکمال ص۵۸۵) مگر برقؔ صاحب لکھتے ہیں اُن کی عمر صرف ساڑھے نو برس تھی (دو اسلام ص۷۱ طبع اوّل وص۶۷ طبع ششم)

تابعی کو صحابی بتانا۔

۸۔ حضرت علقمہؒ بالاتفاق تابعی تھے لیکن برقؔ صاحب ان کو صحابی بتاتے ہیں۔ (دو اسلام ص۱۷۰ طبع اوّل وص۱۸۳ طبع ششم)

ایک قصہ گو کو قصاص نامی آدمی بتانا

۹۔ ایک مقام پر ایک قاص (یعنی قصہ گو اور واعظ) وعظ سنا رہا تھا (دیکھیے موضوعات کبیر ص۱۳ وغیرہ) مگر برقؔ صاحب ان کو قصاص نامی خطیب لکھتے ہیں (دو اسلام صفحہ ۸۷ طبع اوّل اور اب ندارد)

فقہاء کرامؒ پر افتراء

برقؔ صاحب لکھتے ہیں کہ ہمارے فقہاء کہتے ہیں کہ ادائے زکوٰۃ کے لیے ایک وقت ماہِ رجب اور مقدار اڑھائی فیصدی وغیرہ معین ہے (دو اسلام صفحہ ۱۲۶ طبع اول وص۱۴۰ طبع ششم)

جواب: بلاشک سونے اور چاندی وغیرہ کی زکوٰۃ میں نصاب کی تکمیل کے بعد اڑھائی فیصدی مقدار مقرر ہے لیکن یہ مقدار فقہاء کرامؒ کی خانہ ساز اور مخترع نہیں ہے بلکہ یہ تو صحیح اور مرفوع احادیث سے ثابت ہے جو تواتر کے درجہ کو پہنچ چکی ہیں۔

اس لیے زکوٰۃ کی مقدار کو فقہاء کرامؒ کی طرف منسوب کرنا خالص افترا ہے۔ علاوہ ازیں برقؔ صاحب نے فقہاء کرامؒ کی طرف یہ بھی نسبت کی ہے کہ انہوں نے رجب کا مہینہ زکوٰۃ کے لیے متعین کیا ہے تو یہ بھی سراسر بہتان اور سفید جھوٹ ہے۔ یہ کس امام اور فقیہ نے لکھا ہے کہ زکوٰۃ کے لیے رجب کا مہینہ مقرر ہے؟ برقؔ صاحب ذرا ہمت کر کے کسی ایک امام کا ہی نام تو لیجیے۔ دیدہ باید۔

شرعی زکوٰۃ کا انکار

۱۱۔ برقؔ صاحب لکھتے ہیں کہ ہر قسم کی مالی قربانی زکوٰۃ سمجھی جائے گی (دو اسلام ص ۱۲۶ طبع اول و ص ۱۴۰ طبع ششم) اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ہم عرض کر رہے تھے کہ زکوٰۃ کا کوئی خاص وقت معین نہیں (دو اسلام ص ۱۲۷ طبع اوّل و ص ۱۴۱ طبع ششم)

جواب: برقؔ صاحب کے نزدیک شاید یہ بھی زکوٰۃ ہی ہوگی۔ کہ کسی فقیر و محتاج کو ایک وقت کا کھانا کھلا دیا جائے۔ سالن دینے کی قربانی کر دی جائے۔ اچار ہی روٹی پر رکھ دیا جائے یا پھٹا پرانا کپڑا مرحمت فرما دیا جائے یا کسی کو بوسیدہ بوٹ اور بیکار کوٹ اور پتلون عنایت کر دی جائے اور نہ سہی تو مٹھی بھر آٹا کسی مسکین کو دے دیا جائے کیونکہ یہ سب امور از قسم مالی قربانی ہیں اور اسی کا نام برقؔ صاحب کے نزدیک زکوٰۃ ہے۔ اور مُلّا بیچارہ یہ کہتا ہے کہ بلاشک یہ جملہ امور اعانت اور امداد کا پسندیدہ طریقہ ہے۔ مگر یہ نفلی صدقہ ہوگا۔ زکوٰۃ نہ ہوگی زکوٰۃ میں سونا چاندی، سامان تجارت، زمین کی پیداوار اور مال و مویشی میں سے ایک مخصوص اور متعین مقدار دینی ضروری ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ فیض ترجمان سے ثابت ہے کہ اس کے لیے حولان حول (یعنی سال کا پورا ہونا) شرط ہے اور اس لحاظ سے اس کا وقت معین ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب بھی کسی کے پاس مال آجائے اُسی وقت سے اس کا سال شروع ہو جائے گا۔ اور سب کے لیے ایک ہی مہینہ متعین نہیں ہے۔ یہ ہیں بقول برقؔ صاحب مُلّائی قیود جن کو وہ برداشت نہیں کر سکتے چنانچہ ایک مقام

پھر لکھتے ہیں کہ مُلّا سے میرا نزاع اسی بات پر ہے کہ وہ حدیث کو آگے لا کر بے شمار ظواہر کو جزوِ اسلام بنانا چاہتا ہے۔ اور میں قرآن کو پیش کر کے ملّت کو ان مُلّائی قیود سے آزاد کرانا چاہتا ہوں (بلفظہٖ دو اسلام صـ۱۱۴ طبع اول اور اب ندارد)۔ شاباش برقؔ صاحب آپ نے دل کی بات کہی ہے۔ آخر حدیث شریف کے بیشمار ظواہر ہی نے تو آپ کو پریشان اور بے تاب کر رکھا ہے۔ آپ کو تو بہت مختصر سے اسلام کی ضرورت ہے جو سینما میں بھی آپ کے جیب میں رہے اور کلب میں بھی نہ داڑھی رکھنی پڑے نہ ذکر اللہ کرنا پڑے نہ استنجا کرنے کی ضرورت پڑے نہ مسواک کی۔ کون مسجدوں میں بیٹھ کر صبح و شام ست نام جپتا رہے۔ ضرورت تو ایسے اسلام کی ہے جس میں نہ کلمہ توحید پڑھنے کی حاجت باقی رہے اور نہ رسولوں پر ایمان لانے کی بیشمار ظواہر پر آخر کون اور کب تک اور کیسے عمل کر سکتا ہے؟

غرضیکہ اس تہذیب و تمدن کے زمانہ میں نام کے اسلام کی ضرورت ہے۔ کام کا اسلام کس کام کا؟ ؎

صبر خودداری دلیری حق پرستی اب کہاں
رکھ لیا اچھا سا اک نام اور مسلماں ہو گئے

یہ ہے برقؔ صاحب کی تحقیق۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکومت اور اس کی شریعت میں زکوٰۃ صدقہ فطر۔ عشر اور قربانی وغیرہ سے غرباء اور مساکین کے حقوق کی پوری پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ اگر زکوٰۃ وغیرہ کا نصاب اور وقت متعین نہ ہو تو گویا مساکین اور فقراء کا عالم اسباب میں ایک اسلامی حکومت میں کوئی گذارہ نہیں ہو سکے گا اور برقؔ صاحب اور ان کے ہمنوا یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ قربانی وغیرہ سے مال ضائع ہوتا ہے اور مسلمانوں کی حالت ابتر ہوتی جا رہی ہے لہٰذا ۔ ان احکام کو قطعاً ادا نہ کیا جائے اور مسلمانوں کی اس ابتری کو شریعت کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

کوئی شریعت کی آڑ لیکر ہماری جڑیں کاٹ رہا ہے۔ کوئی خلاف الیہ کا راگ الاپ کر ہمیں مرنے مرنے پر پھینک رہا ہے

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اس بُری حالت کا ذمہ دار کون ہے ؟ اس کا جواب صرف ایک ہے کہ مُلّا اور اس کا حدیثی اِسلام (دو اسلام صفحہ ۲۶۶ طبع اوّل اور اب طبع ششم صفحہ ۲۶۹ میں الفاظ بدل دیئے ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ مُلّا اور اس کا اسلام اھ)

آپ نے دیکھا کہ برق صاحب کے نزدیک مُلّا اور حدیثی اِسلام نے زکوٰۃ، قربانی اور عُشر وغیرہ ادا کرنے کی تلقین کر کے مسلمانوں کی حالت کس طرح ابتر کر دی ہے۔ اور اُن کو بامِ عروج سے اُٹھا کر کس طرح قعرِ مذلّت میں گرا دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سینما اور عیاشی وغیرہ پر جو کچھ صرف ہو اس سے مسلمانوں کی حالت نہ بدلے مگر زکوٰۃ کی مقدار اور قربانی نے مسلمانوں کو کہیں کا نہ چھوڑا۔ اور یہ بھی مت بھولیے کہ امریکہ کی جمہوریت اور برطانیہ کی سامراجیت کی کیا مجال ہے کہ ہماری جڑوں تک پہنچ سکے۔ ہاں البتہ حکومت الٰہیہ اور شریعت کی سچی آواز سے جڑیں بھی کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور مرکز سے بھی دُوری اور بُعد واقع ہو جاتا ہے اور مُلّا اور مُلّا کے اِسلام سے برق صاحب کے حواس باختہ ہو گئے ہیں یہ ہے برق صاحب کی تدقیق۔ سبحان اللہ۔

اللہ تعالیٰ کو بائیبل وغیرہ کا مصنف کہنا۔

۱۲۔ برق صاحب نے دو اسلام صفحہ ۳۵۱ طبع اوّل و صفحہ ۳۵ طبع ششم) میں اللہ تعالیٰ کو قرآن کریم اور بائیبل کا مؤلف اور مصنّف لکھا ہے۔ پہلے تو یہ بات قابلِ غور ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کی ذات پر مؤلف اور مصنّف کا اطلاق درست ہے ؟ اور اگر بالفرض درست ہے تو کیا اُسی بائیبل کا وہ مؤلف ہے جس کے چند نمونے پہلے پیش کئے جا چکے ہیں۔

برق صاحب کی چند ایک تضاد بیانیاں۔

پہلی تضاد بیانی:۔ اب آپ برق صاحب کی تضاد بیانی کے چند نمونے ملاحظہ کر لیجئے۔ دو اسلام صفحہ ۱۵۹ طبع اوّل و صفحہ ۱۷۱ طبع ششم) میں لکھتے ہیں کہ رفتہ رفتہ احادیث کا

وہ طومارِ عظیم جمع ہو گیا کہ صحیح و غلط کی تمیز محال ہو گئی۔ اور صد ۲۴۱ طبع اول و صد ۲۳۹ طبع ششم) میں لکھتے ہیں:۔

دوم کہ حدیث کا مضمون صحیح ہو اور ان معنوں میں ہزاروں احادیث صحیح ہیں اور صد ۲۴۲ طبع اول و صد ۲۴۰ طبع ششم میں لکھتے ہیں اس طرح کی ہزارہا احادیث ہمارے پاس موجود ہیں جو نہ صرف تعلیمات قرآن کے عین مطابق ہیں بلکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مطہرہ کی مکمل تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب تمیز محال ہے تو صحیح و غیر صحیح کا معیار کیا ہو گا؟

دوسری تضاد بیانی

اور صفحہ ۱۱۲ طبع اول و صد ۱۳۰ طبع ششم میں لکھتے ہیں کہ قرآن کے گنے ہوئے چند سادہ سے ابدی احکام کے سوا ہم کسی اور ہنگامی حکم یا وقتی ہدایت پر ہمیشہ کے لیے قطعاً مامور نہیں۔ لیکن صد ۲۰۳ طبع اول اور اب نذارد) میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عمل اُمّت کے لیے واجب التقلید ہے۔ (یہ عبارت برق صاحب پر ڈاڑھی وغیرہ بے شمار اعمال میں حجت ہے وَكَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا)

تیسری تضاد بیانی

صد ۱۸۹ طبع اول و صد ۲۰۳ طبع ششم میں لکھتے ہیں کہ سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات میں ہمیں تمام سابقہ آسمانی صحائف پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اگر وہ کتابیں محرف ہو چکی تھیں اور غلط سلط تھیں تو ان پر ایمان لانے کا مقصد؟ لیکن صد ۳۹ طبع اوّل و صد ۵ طبع ششم میں لکھتے ہیں۔ بعض گذشتہ انبیائے کے الہامی صحائف میں اُن کی احادیث بھی شامل ہو گئی تھیں۔ اور کتب الٰہی کا حلیہ بگڑ گیا تھا ——— سچ ہے دروغ گو را حافظہ باشد۔

چوتھی تضاد بیانی

صـ۵۹ طبع اول (و صـ۲۰ طبع ششم مگر الفاظ بدل دیے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ لیکن روایت احادیث میں سب سے بازی لے گئے) میں حضرت ابوہریرہؓ کی احادیث پر کلام کرتے ہوئے

برق صاحب کی بائبل کے متعلق تضاد بیانی

(۱) میرا یہ ایمان ہے (تفصیل آگے) کہ بائبل میں کوئی تحریف واقع نہیں ہوئی (بلفظہ ایک اسلام صـ۹۱)

(۲) انجیل متی ۱۵/۱۸-۱ کی ایک آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ کیا یہ ارشاد اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے تک تمام پہلے صحائف اصلی صورت میں موجود تھے اور ان میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی تھی (بلفظہ صـ۱۳۱ ایک اسلام) پھر آگے اسی صفحہ پر لکھتے ہیں۔ اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ حضرت مسیح کے زمانہ تک کتب مقدسہ میں کوئی تحریف نہیں ہوئی تھی (بلفظہ صـ۱۳۱)

(۳) جس طرح قرآن کریم کو تمام شبہات سے بالاتر سمجھا گیا ہے اسی طرح کتاب مقدس (صحائف اولیٰ) کو بھی شک و شبہ سے منزہ کہا گیا ہے۔

(بلفظہ ایک اسلام صـ۱۳۲)

(۱) ... انبیاء ... والتے سے ... میں ... پس جلتے ... کسی بخت نصر نے کوئی نقل رکھ لی ورنہ ... زمانہ میں انبیاء کا ... ان صحائف کی رو سے ایک وقت میں کئی کئی سو انبیاء موجود ہوتے تھے جہاں انبیاء و صحائف کی یہ کثرت ہو وہاں صحائف کی قدر کون کرتا ہے۔ اور حفاظت وحی کی ضرورت کسے محسوس ہوتی ہوگی۔ لازماً صحائف کی بہت بڑی تعداد ضائع ہوگئی۔ کچھ یہود کی لاپرواہی سے اور کچھ حملہ آوروں کی دست برد سے جب ۵۸۶ قبل مسیح میں بابل کے تاجدار بخت نصر نے یہود پر حملہ کیا تو ان کی کتنی کتابیں جلا ڈالیں تحقیقی طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ (بلفظہ ایک اسلام صـ۹۵)

(۲) تاریخ عالم سے پتہ چلتا ہے کہ ہر امت پر کوئی نہ کوئی ایسا وقت آتا ہے جب وہ فقہی اور کلامی مباحث میں الجھ کر فرقوں میں بٹ جاتی ہے اور ہر فرقہ اپنی تائید میں کچھ اقوال و احادیث تراش کر انہیں اپنے انبیاء کی طرف منسوب کر دیتا ہے یہود و نصاریٰ صدیوں اس مرض میں مبتلا رہے اور اس دوران انہوں نے اس قدر جعلی صحائف تراشے دواعظ ۱۱۳/۱) کہ ایک زمانے میں اناجیل کی تعداد ۵۸ تک پہنچ گئی تھی اور یہی حال یہودی صحائف کا تھا (بلفظہ ایک اسلام صـ۹۴)

نکلتے ہیں کہ۔ اور احادیث بھی ایسی کہ سارا قرآن ایک طرف اور ابوہریرہؓ کی احادیث دوسری طرف لیکن صفحہ ۲۶۰ اور صفحہ ۲۶۱ طبع اوّل وصفحہ ۲۶۳ (وصفحہ ۲۶۴ طبع ششم مگر خوف کے مارے نام نہیں لیا) میں ایسی حدیثوں سے استدلال کیا گیا ہے جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیں۔

حدیث سے انتہائی نفرت

لکھتے ہیں، لیکن حدیث! تو بہ ہی بھلی اس کا تو وہ ستیاناس ہوا کہ اس سے زیادہ محرف بریدہ۔ تراشیدہ۔ اور مسخ شدہ لٹریچر دنیا کے صفحے پر موجود نہیں (صفحہ ۱۰۸ طبع اول وصفحہ ۱۲۴ طبع ششم) (حالانکہ پہلے حوالہ گذر چکا ہے کہ ہزار احادیث صحیح ہیں) لیکن تورات کے متعلق لکھتے ہیں "تورات اصل حالت میں تھی اور وہی ہم تک پہنچی ہے (صفحہ ۱۹۴ طبع اول وصفحہ ۲۰۸ طبع ششم)

برق صاحب بحیثیت جج

یہی نہیں کہ برق صاحب صرف ایک محقق ہی ہیں بلکہ وہ بڑی ہستیوں پر انتہائی سزا کا فیصلہ صادر کرنے والے ایک جج بھی ہیں۔ چنانچہ وہ صاف لکھتے ہیں "لیکن معاویہؓ نے بغاوت کی اور اسلام میں لا انتہا مفاسد کا دروازہ کھول دیا۔ معاویہؓ کا جرم ایسا تھا کہ جس کی پاداش میں وہ انتہائی سزا کے قابل تھا۔ (طبع اسلام طبع اوّل صفحہ ۱۲۶ وصفحہ ۱۵۰ طبع ششم مگر الفاظ بدل دیے کہ معاویہؓ کا یہ جرم قابل ستائش نہ تھا) جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کی زوجۂ محترمہ حضرت ام حبیبہؓ کے حقیقی بھائی اور کاتب وحی صحابی کے متعلق یہ فیصلہ برق صاحب کے بغیر کون صادر فرما سکتا ہے؟ اور کون ان پر باغی اور اسلام میں لا انتہا مفاسد کے بانی ہونے کا فیصلہ صادر کر سکتا ہے؟

ازواج مطہرات رضہ کے سلسلہ میں ایک نیا انکشاف

لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے بغیر (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی) باقی سب

(ازواج مطہراتؓ) بیوائیں تھیں۔ (دو اسلام صـ۲۱۸ طبع اوّل اور اب صـ۲۹۹ طبع ششم میں نو بیوائیں اور ایک مطلقہ لکھی ہے) مگر یہ بھی غلط ہے کیونکہ حضرت زینبؓ بنت جحش مطلقہ تھیں ان کا پہلا نکاح حضرت زیدؓ سے ہوا تھا۔ جن کا نام لے کر قرآن کریم میں اس واقعہ پر پوری بحث کی گئی ہے۔ اور برق صاحب کی دو کھلی اور صریح غلطیاں (یہ کہ جنگ بدر اور اُحد دونوں ۲ھ میں ہوئیں اور یہ کہ بنو مصطلق اور مریسیع دو الگ الگ جنگیں تھیں) پہلے بیان کی گئی ہیں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے وہاں ہی ملاحظہ کر لیں۔

یہ ہیں برق صاحب کی چند علمی۔ تاریخی اور تنقیدی معلومات جن کے بل بوتے پرؔ وہ ساری دنیا کو چیلنج دے رہے ہیں۔

برق صاحب کے نزدیک متقی صرف امریکہ، روس اور برطانیہ وغیرہ اقوام ہیں

اب آخر میں ہم برق صاحب کی ایک اور دینی خدمت عرض کر کے کتاب کو ختم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ متقین کا مصدر ہے تقویٰ جس کے معنیٰ ہیں حفاظت، بچاؤ، ڈیفنس یعنی متقی وہ لوگ ہیں جن کا ڈیفنس مضبوط ہو جن کی سرحدیں مستحکم ہوں جو مہیب عسکری طاقت کے مالک ہوں اور جن کا کردار اتنا بلند ہو کہ ان پر کسی قسم کا حملہ نہ کیا جا سکے، اور آج تقویٰ[1] کی یہ

---

[1] اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ متقی کا مادہ تقویٰ ہے تقویٰ کے لفظی معنیٰ ہیں بچاؤ۔ دفاع جس قوم کی سرحدیں کمزور ہوں جو آنکھ کے بدلے آنکھ نہیں نکال سکتی جو ظالم کا منہ نہیں توڑ سکتی ایسی کمزور قوم لاکھ نمازی ہو سال بھر روزے رکھتی ہو اور گلا پھاڑ پھاڑ کر درود پڑھتی ہو قرآن کی اصطلاح میں متقی نہیں ہو سکتی۔ (بلفظہ جہانِ نو صـ۱۴۶) گویا برق صاحب کی اس تفسیر کی رُو سے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ ابتدائی دور میں اور خاص طور پر مکی زندگی میں متقی نہ تھے (العیاذ باللہ) کیونکہ اس وقت نہ تو ان کی سرحدیں مضبوط تھیں اور نہ آنکھ کے بدلے آنکھ نکال سکتے تھے۔ اور ظالم کا منہ توڑ جواب دینا تو اس وقت ان کے بس میں نہ تھا۔ مگر باوجود اس کے وہ نمازیں پڑھتے تھے اور ان کو حکم تھا۔

اَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَكُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ ﴿﴾ نماز قائم کرو اور ہاتھ روکے رکھو۔

شان خوفناک اسلحۂ جنگ کے بغیر پیدا نہیں کی جا سکتی الخ (دو اسلام ص ۲۶۲ طبع اول و ص ۲۶۵ طبع ششم)

اس میں شک نہیں کہ اسلام نے اپنی عسکری طاقت کو ہر طرح سے مضبوط کرنے کی تلقین کی ہے۔ اور وقت اور حالات کے مناسب جو آلات جنگ مہیا ہو سکیں ان سے کام لینے کی ترغیب اور حکم دیا ہے۔ لیکن جس موقع پہ قرآن کریم تقویٰ کا استعمال کرتا ہے وہ باطنی اور روحانی صفت ہے۔ جس سے حقیقت میں انسان انسان اور مسلمان بنتا ہے۔ اور اسی روحانی فوقیت سے مسلمانوں نے باوجود قلّت سامان اور تعداد کے دنیا میں اپنا اثر قائم کیا اور نقش بٹھایا۔ گو وہ مبارک ہستیاں آج خود دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کے آثار تو موجود ہیں اور وہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ؎

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے ایک حرف غلط
لیکن اُٹھے بھی تو نقش اپنا بٹھا کے اُٹھے

لیکن برق صاحب مادہ پرست دنیا سے اتنے مرعوب اور اُن پہ اتنے فریفتہ ہیں کہ قرآن کریم سے ثابت کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں کہ مسلمان بھی وہی ہیں اور متقی بھی صرف وہی ہیں گویا جس کے پاس تباہی اور بربادی کے اسباب زیادہ ہوں گے اور اسلحۂ جنگ فراوانی سے ہو گا جس کے ذریعے سے وہ آناً فاناً آباد شہروں کو کھنڈرات کی شکل میں بدل سکتے ہوں۔ اور جن کے پاس اٹیم بم اور ہائیڈروجن بم ہوں۔ جن کے نام سے انسانیت لرزہ براندام ہو جاتی ہے۔ وہی اصلی متقی ہوں گے۔ برق صاحب لگی لپٹی کیوں کہتے ہیں؟ صاف کیوں ارشاد نہیں فرما دیتے کہ اس وقت متقی صرف امریکہ، روس اور برطانیہ وغیرہ طاقتوں کا نام ہے۔ چنانچہ برق صاحب لکھتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے ان اعمال کی بدولت عملاً مسلم ہیں اور ہم مسلمان عملاً کافر۔ اللہ اعمال کو دیکھتا ہے نہ کہ خالی عقائد کو۔ وراثت ارضی اللہ کا سب سے بڑا انعام ہے جو بلند کردار اور

صالح الاعمال کو دیا جاتا ہے۔ صلاحیت سے مراد لمبی ڈاڑھی تسبیح، ڈھیلا اور استنجاء نہیں الخ (بلفظہ ایک اسلام ص ۲۷۹)

قارئین کرام یہ ہے برق صاحب کا نظریہ اور ان کی کتاب "دو اسلام کا پس منظر"

اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ ہمیں اپنے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر قائم رہنے کی توفیق بخشے کہ جب تک جئیں تو مسلمان رہ کر اور جب دنیا سے رخصت ہوں تو مسلمان ہو کر۔ آمین ثم آمین۔ وصلی اللہ علی رسولہ محمد و علی آلہ واصحابہ وسلم

ابو الزاہد :- ۴ صفر ۱۳۸۷ھ بوقت ۱۰ بجے شب
نیو سنٹرل جیل ملتان